رجسٹرڈ ایل نمبر 7360

عدد ۶

ماہنامہ میثاق لاہور

زیرادارت

امین احسن اصلاحی

دفتر رسالہ میثاق

رحمانپورہ اچھرہ - لاہور

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

سالانہ چندہ ۶ روپے

وہ سجدہ رُوحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

دعوت الی اللہ کا نقیب

انسانیت کے بگاڑ کا واحد علاج ——— دعوت الی اللہ ہے

اور اس دعوت کیلئے ضروری ہے کہ ———

- اس کا ماخذ خدا کی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہو
- ائمہ سلف نے جو ترجمانی کی ہے وہ پیش نظر ہے۔
- فرقہ وارانہ جھگڑوں اور مناظرہ بازی سے یہ دعوت پاک ہو۔

زیر ادارت
عبدالرحیم اشرف

المنبر

بفضلہ تعالیٰ انہی امتیازات دعوت سے ممتاز ہے

- ★ المنبر اسلامیان عالم کے اتحاد کا داعی ہے اور عالم اسلام کی معلومات حاصل کرنیکا بہترین ذریعہ ہے
- ★ اس کا ہر پرچہ دین کے اساسات پر یقین پیدا کرنیوالے اثر انگیز مقالات و مضامین کا مرقع ہوتا ہے۔
- ★ فاسد افکار اور باطل نظریات کا تحلیل و تجزیہ اس کی خصوصیت ہے۔
- ★ دین سے بیزاری پیدا کرنے والے تحریکات کا بے باک ناقد ہے۔

المنبر ——— اسی سجدے کا نقیب و داعی ہے جس سے رُوحِ زمیں کانپ جایا کرتی تھی ———
اور آج منبر و محراب اس سجدے کو ترستے ہیں۔

زر تبادلہ
سالانہ — دو روپے
ایک پرچہ
4 آنے

مستقل عنوانات

- ★ تذکیر و تفہیم
- ★ حدیث و منکرین حدیث
- ★ ڈاکٹر حسن البنا شہید
- ★ حدیث ربوہ
- ★ عالم اسلام
- ★ تربیت و تزکیہ
- ★ احادیث قدسیہ

★ ممبران پندرہ روزہ الحسنات کو ایک پرچہ مفت، ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کے خریدار بھی رعایت کے مستحق ہیں، زر تبادلہ بذریعہ منی آرڈر دفتر کو بھجوا دیں

منبر لائلپور

مینیجر
المنبر لائل پور

مطبوعہ اشرف پریس۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

ماہنامہ **میثاق** لاہور

★

فہرست مضامین

جلد ۱	بابت ماہ جولائی ۱۹۵۹ء ۔ مطابق ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ	عدد ۲

تذکرہ وتبصرہ ——— امین احسن اصلاحی ۱

تدبر قرآن

تفسیر سورہ فاتحہ ——— امین احسن اصلاحی ۹

تزکیہ نفس

انفاق اور آفات انفاق ——— امین احسن اصلاحی ۲۲

اسلامی قانون

اسلامی قانون میں حرکت وارتقا ——— امین احسن اصلاحی ۳۶

سفر حج

دس دن مدینہ منورہ میں ——— امین احسن اصلاحی ۴۴

★

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق ۱۱۔ احمد اسٹریٹ اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تذکرہ و تبصرہ

میثاق کے پہلے پرچے میں، اس کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے، تجدید میثاق کی جس دعوت کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، اس دوسرے پرچے میں بھی اس کی وضاحت کرائی تھی۔ اس وضاحت سے اس دعوت کی اصلی اہمیت بھی ہر شخص کے سامنے آجاتی اور ان لوگوں کے جو بندے اس راہ میں قدم اٹھانا چاہتے انھیں تفصیل کے ساتھ یہ بات بھی معلوم ہوجاتی کہ کتاب و سنت کی روشنی میں اس راہ میں ان کا پہلا قدم کیا ہوسکتا ہے۔ اس دعوت کے تدریجی مراحل پر غور کرنے کی فطری ترتیب یہی ہوسکتی ہے اور یہی ہم نے اختیار کرلی چاہی ہے لیکن اس وقت بعض مسائل ہمارے سامنے ایسے آگئے ہیں جو مستحق ہیں کہ ہم ان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کریں اگرچہ ہمیں اس کے لیے اپنے پیش نظر مباحث سے وقتی طور پر صرف نظر بھی کرنا پڑے۔

―――(۲)―――

ماہ گزشتہ کے وسط میں لاہور میں سینیٹ ہال میں "ہماری آئیڈیا لوجی اور قومیت" کے عنوان پر ایک مباحثہ ہوا جس کی صدارت جسٹس ایس اے رحمان چیرمین لا ریفارمز کمیشن نے فرمائی۔ موصوف نے مباحثے کے صدر کی حیثیت سے جو تقریر کی ہے وہ لاہور کے دو روزناموں، پاکستان ٹائمز اور سول میں ہماری نظر سے گذری ہے۔ یہ تقریر ہمارے نزدیک ایک نہایت اہم تقریر ہے جس میں موصوف نے اس ملک کے حکمرانوں اور اس ملک کے ذہین طبقہ کو وقت کے سب سے بڑے اہم مسئلے میں سب سے زیادہ صحیح مشورے دیئے ہیں۔ موصوف اہل سیاست کے طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ہماری عدلیہ کے اساطین میں سے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ اس کمیشن کے بھی صدر ہیں جو ہماری حکومت نے موجودہ قانونی اور عدالتی نظام کی اصلاح سے متعلق سفارشات پیش کرنے کے لیے قائم کیا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں سے اس ملک کے آئینی قانون اور اس کی آئیڈیا لوجی سے متعلق مشورہ دینے کے لیے جس بہتر پوزیشن میں وہ ہیں دوسرا کوئی شخص شاید ہی ہو۔ وہ دنیا کے مختلف قوانین کی قدر و قیمت کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور قانونی کمیشن کے سلسلے میں ان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہوں گی ان کی روشنی

میں وہ اس ملک کے جمہور کے جذبات و احساسات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ اس وجہ سے ہم ان کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ ہم سے زیادہ اہمیت ان کے مشوروں کو ہماری حکومت کے عمائد دیں گے۔

موصوف نے سب سے زیادہ زور اس ملک میں آیندہ قائم ہونے والے نظام میں اس ملک کی اسلامی آئیڈیا لوجی کے تحفظ پر دیا ہے۔ اس کی دلیل کے طور پر انھوں نے جو بات کہی ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی شخص بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ وہ یہ کہ یہی اسلامی آئیڈیا لوجی ہے جس نے پاکستان کو وجود بخشا ہے اور جس کی خاطر مسلم عوام نے اس ملک کے قیام کی راہ میں جان اور مال کی بازیاں کھیلی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس روحانی محرک نے پاکستان کو وجود بخشا ہے اگر ملک کے آیندہ نظام میں اسی کا کماحقہ تحفظ نہ ہوسکے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان کے جسم کے اندر جو قوت محرکہ ہے وہی سرے سے ختم ہوجائے گی اور خدانخواستہ یہ چیز اگر ختم ہوجائے تو پھر اس چیز کا بدل دنیا کی کوئی دوسری چیز بھی نہیں ہوسکتی۔ ہم اپنی ضرورت کی دوسری تمام چیزیں دوسروں سے قرض یا مستعار یا بقیمت حاصل کرسکتے ہیں لیکن جس نظریہ حیات نے ہمیں وجود بخشا ہے وہ بھی کسی دوسرے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم کو اپنا ملی وجود عزیز ہے تو ہمیں نہ صرف اس کو باقی رکھنا ہے بلکہ اس کو زیادہ سے زیادہ موثر اور فعال بنانا ہے۔

جسٹس موصوف نے یہ بات بھی بڑے پتے کی کہی ہے کہ اس وقت مغربی ممالک میں دو بالکل متضاد نظریات کی جو کشمکش برپا ہے اس کشمکش کو اگر ختم کرسکتی ہے تو صرف اسلامی آئیڈیا لوجی ہی ختم کرسکتی ہے، اسی کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ یہ دونوں کے بیچ بیچ نکال کر ان کو ایک نقطۂ اعتدال اور ایک مرکز عدل پر جمع کرسکے اور دنیا کو اس بین الاقوامی امن و صلح کی راہ دکھا سکے جس کو دنیا اس وقت پورے اضطراب کے ساتھ تلاش کررہی ہے لیکن جس کا کوئی سراغ نہیں پارہی ہے۔ جسٹس موصوف کے اس ارشاد کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ اس وقت بجائے اس کے کہ ہم انہی دو متحارب نظریات میں سے کسی کے حلیف اور کسی کے حریف بننے کی کوشش کریں ہمارا اصلی مقام یہ ہے کہ ہم پچھے عزم و ہمت کے ساتھ اپنی مخصوص آئیڈیا لوجی کو لے کر اٹھیں اور دنیا کو اس روشنی کی مدد سے ان ظلمات سے نکالیں جن کے اندر وہ سائنس کی تمام ترقیوں کے باوجود اس وقت ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔

جسٹس موصوف اسلامی قانون کو بیک وقت ثبات اور تغیر کی دوگونہ صلاحیتوں کا جامع سمجھتے ہیں اور اسی بنا پر وہ توقع رکھتے ہیں کہ اسلامی قانون ہر زمانے اور ہر طرح کے حالات کے اندر ہماری رہنمائی کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ ہمارے نزدیک موصوف کی یہ بات بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ ہم نے میثاق کی اسی اشاعت میں "اسلامی

قانون میں حرکت وارتقا" کے عنوان سے ایک مضمون دیا ہے جس سے اسلامی قانون کی وہ فطرت اچھی طرح واضح ہو سکے گی جس کی طرف جسٹس موصوف نے اشارہ کیا ہے۔ موصوف کی تقریر کا جو متن موصول ہوا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اسلامی قانون میں سنّت کی جو واجبی اہمیت ہے اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے مزید اطمینان کا باعث ہے۔

ہمیں موصوف کے اس تجزیہ سے بھی پورا پورا اتفاق ہے کہ اس وقت ہمارے اندر عموماً دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو قدیم طرز کی تعلیم پائے ہوئے ہیں اور اپنے مخصوص طرزِ فکر کی وجہ سے جدید مسائل اور جدید تقاضوں سے ناآشنا ہیں دوسرے وہ لوگ ہیں جو مغربی تعلیم پائے ہوئے ہیں اور جو اپنے یک رخے پن کے سبب سے اسلام اور اسلامی روایات سے بے خبر ہیں۔ یہ لوگ قدرتی طور پر اس وہم میں مبتلا ہیں کہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی قانون موجودہ حالات میں قابلِ عمل نہیں ہے۔ جسٹس موصوف ان دونوں کو مخلص اور نیک نیت تسلیم کرنے کے باوجود ان دونوں کے نقطہائے نظر کو یک طرفہ سمجھتے ہیں۔ موصوف کا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ اپنے اپنے طرزِ فکر میں الگ الگ ہونے کے باوجود اس ملک میں ایک عادلانہ نظام کے قیام کی خواہش میں مشترک ہیں۔ اس وجہ سے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی صورتیں اختیار کی جائیں کہ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کر سکیں۔ موصوف کے نزدیک اس ملک کے استحکام اور اس کی سلامتی کے نقطۂ نظر سے اس چیز کی بڑی اہمیت ہے۔

اپنے اسی نقطۂ نظر کے تحت جسٹس موصوف اس لاکمیشن کو بڑی اہمیت دیتے ہیں جو جسٹس محمد شریف صاحب کی قیادت میں اسلامی قانون کی ترتیب و تدوین کے لیے قائم ہوا تھا۔ موصوف کا خیال یہ ہے کہ یہ کمیشن اگر کام کرنے کا موقع پاتا تو اس سے اس خلیج اختلاف کو پاٹنے میں بڑی قیمتی مدد ملتی جو جدید و قدیم نقطہائے نظر کے حامیوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ جسٹس موصوف نے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ ہماری حکومت اس کمیشن کے ازسرِ نو احیا کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرے گی تاکہ یہ کمیشن دو مختلف سمتوں میں بہنے والے دو دریاؤں کو ایک سنگم پر جمع کر سکے۔ ہمارے نزدیک موصوف کا یہ مشورہ بھی بڑا قیمتی مشورہ ہے۔ خدا کرے یہ مشورے موثر اور مقبول ہوں۔[1]

—— (۳) ——

بعض دوستوں نے مجھے معاصر ترجمان القرآن لاہور کے ایک مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے جو معاصر مذکور کی مئی ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں "دین میں مصلحت و ضرورت کا لحاظ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ان دوستوں کا یہ خیال ہے کہ اس مضمون کے ذریعہ سے چاہے اس مضمون کا جواب مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں ہم نے صاحب ترجمان القرآن کے

---

[1] ہم یہ نوٹ لکھ چکے تھے کہ فیروز سنز لاہور کی طرف سے بھی چار پمفلٹ موصول ہوئے جو مذکورہ بالا مباحث کے چار دوسرے فاضل مقررین کی تقریروں پر مشتمل ہیں۔ یہ تقریریں بھی نہایت قابلِ توجہ ہیں۔ خدا نے چاہا تو آئندہ اشاعت میں ہم ان تقریروں کے مفید حصے بھی دیں گے اور ان کے اندر جو مفید معلومات ان کی طرف سے پیش کی گئی ہیں

حکمت عملی والے نظریہ پر تنقید کی ہے اور جو مقام رسالت اور الفرقان میں شائع ہوا ہے۔ معاصر ترجمان کا یہ مضمون کوئی مستقل مضمون نہیں ہے بلکہ یہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی اعلام الموقعین کی ایک فصل کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بھی خود صاحب ترجمان القرآن کی طرف سے نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ ان کے ادارے کے ایک کارکن صاحب نے پیش کیا ہے اور اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کے لیے عنوان بھی خود اپنی طرف سے منتخب فرمایا ہے اور اصل مضمون میں سے بہت سے حصے غالباً غیر ضروری سمجھ کر حذف بھی فرما دیئے ہیں۔ اور اس سے زیادہ خاص بات یہ ہے کہ یہ ظاہر کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی ہے کہ اس مضمون کو ترجمان کے صفحات میں دینے سے ان کا مقصود کیا ہے؟ محض اعلام الموقعین کی ایک مفید فصل کے مطالب سے عام اردو خواں طبقہ کو مستفید کرنا یا صاحب ترجمان القرآن کے حکمت عملی والے نظریہ کی تائید؟

یہ مضمون اس نزاع و اختلاف سے، جو ہمارے اور صاحب ترجمان القرآن کے درمیان ہے، اس قدر غیر متعلق ہے کہ میں کم از کم صاحب ترجمان القرآن کے متعلق یہ گمان نہیں کر سکتا کہ وہ اس کو اپنے مخصوص نظریہ حکمت عملی کی تائید میں پیش کریں گے۔ تاہم اگر وہ اس کو پیش کرتے ہیں تو ہماری گذارش صرف یہ ہے کہ وہ توریہ کا انداز نہ اختیار کریں بلکہ صاف الفاظ میں فرمائیں کہ جس طرح وہ حکمت عملی کے تقاضوں کے تحت ایک قائد تحریک اسلامی کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ شریعت کے کسی حرام کو حلال کر سکتا ہے اسی طرح حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک قائد تحریک اسلامی کے لیے تحریم و تحلیل کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ اگر یہ بات صاحب ترجمان القرآن فرما دیں تو پھر میرے اوپر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ جس طرح اس سے پہلے میں نے اختیار امون البلیتین کے اصول، غیبت اور جرح و تعدیل کے فرق، اور حدیث الائمہ من قریش کے اسرار سمجھانے کی کوشش کی ہے اسی طرح اعلام الموقعین کی مذکورہ فصل بھی سمجھانے کی کوشش کروں۔ اس لیے کہ میں حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کو اس امت کے اساطین میں سے سمجھتا ہوں، میں نے ان کی ہر کتاب کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور اس مطالعہ کے بعد ان کی نسبت میری رائے یہ ہے کہ ان کا دامن غلط نظریات اور غلط عقائد سے بالکل پاک ہے۔

میں اس بات پر جو زور دے رہا ہوں کہ اس معاملہ میں صاحب ترجمان القرآن براہ راست خود اپنی رائے ظاہر فرمائیں اس سے کوئی صاحب غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں یہ بات کسی غرور کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اس کے متعدد وجوہ ہیں۔ اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ صاحب ترجمان القرآن جس نظریے کو ڈیڑھ دو سال سے پورے زور و قوت کے ساتھ پیش کر رہے تھے اپنی تنقید کے بعد مجھ کو بھی انتظار ہے اور قدرتی طور پر دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی انتظار ہے کہ اب موصوف کا اپنے نظریہ اور اپنے پیش کردہ دلائل کے متعلق کیا خیال ہے؟ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے

بقیہ "تذکرہ و تبصرہ"

جو لوگ ان کے سابق موقف سے غلط فہمی میں پڑے ہیں وہ اپنی غلط فہمی کی اصلاح کرلیں اور ہم بھی ان کو دل سے دعا دیں ۔ اور اگر وہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ کے اس مضمون کو پیش کرکے لوگوں کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ انہی کی طرح حافظ ابن قیمؒ بھی ایک قائد تحریک اسلامی کے لیے یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت دین میں ردّ و بدل کرسکتا ہے تو یہ بات بھی انھیں جرأت اور صفائی کے ساتھ کہنی چاہیے تاکہ ان کے موقف کے بارے میں کسی کو کوئی اشتباہ اور تردّد باقی نہ رہے ۔ اور اگر کوئی شخص ان کے اس نظریہ پر تنقید کرنا چاہے تو تنقید کرسکے ۔

اس بارے میں اگر ترجمان القرآن کی طرف سے کوئی وضاحت آگئی تب تو میں اس کی روشنی میں فیصلہ کروں گا کہ مجھے اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت ہے یا نہیں لیکن اگر کوئی وضاحت نہیں آئی تو میں ان شاء اللہ میثاق کی آئندہ اشاعت میں تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا کہ صاحب ترجمان القرآن کا نقطہ نظر کیا ہے اور حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کیا فرماتے ہیں ۔ اللہ گواہ ہے کہ مجھے اس طرح کی چیزیں لکھنے میں کوئی خوشی نہیں ہوتی ، میں ترجمان القرآن کے اس طرح کے مضامین ڈیڑھ دو سال سے پڑھتا اور نظر انداز کرتا رہا ہوں لیکن اب اگر توجہ نہ کرتا تو اس فتنے کے بہت متعدی ہوجانے کا اندیشہ تھا ۔ احباب کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ غلط عقائد اور غلط نظریات کے لیے ہمارے ملک میں کوئی مخصوص گھرانا نہیں ہے ، یہ چیزیں ہر گوشے سے ابھر سکتی ہیں اور جہاں سے بھی یہ ابھریں ان کی اصلاح ہونی چاہیے اور سب سے پہلے ان لوگوں کی غلطیوں کی اصلاح ہونی چاہیے جن سے لوگوں نے خیر کی امیدیں باندھی ہوں ۔ اس لیے کہ ان کی غلطیاں لوگ حقیقتیں سمجھ کر قبول کرلیتے ہیں اور پھر ان سے دستبردار ہونے پر راضی نہیں ہوتے ۔

سیرت

سید احمد شہیدؒ

مصنفہ ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ،

سید صاحب موصوف کی مفصل سوانح حیات ، آپ کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں کی داستان ، اصلاح و تجدید اور احیائے خلافت کی تاریخ اہم مقامات کے نقشے ، کتابت طباعت عمدہ ۔ سرورق دیدہ زیب ۔ ضخامت ۴۸۸ صفحات ، قیمت صرف آٹھ روپے آٹھ آنے

دیگر دینی و علمی کتب ملنے کا پتہ :۔ اَلْمکتبۃ الرحمانیہ ، اچھرہ ، لاہور ۔

مسائل میں اگر لوگوں کو رائے معلوم کرنے کا شوق ہے تو خود صاحب ترجمان القرآن کی رائے معلوم کرنے کا شوق ہے، ان کے ادارے کے دوسرے ارکان کی رائے معلوم کرنے کا شوق شاید ہی کسی شخص کو ہو۔ اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ جب تک صاحب ترجمان القرآن کی طرف سے یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ حافظ ابن قیمؒ کا مضمون کس مقصد سے پیش کیا گیا ہے، میرا اپنی طرف سے یہ فرض کر کے کہ صاحب ترجمان القرآن نے اس کو اپنے نظریے کی تائید میں پیش کیا ہے، اس پر کوئی مضمون لکھ ڈالنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے میں نے ایک بے بنیاد مفروضہ پر ایک تبصرہ لکھ ڈالا ہے اور خود صاحب ترجمان بھی یہ فرما سکتے ہیں کہ اس مضمون کو اس نزاع سے کوئی تعلق نہیں جو ہمارے اور ان کے درمیان ہے، اعلام الموقعین کی یہ فصل ایک غیر متعلق شخص نے محض اپنے شوق سے افادۂ عام کے لیے شائع کی ہے۔

میں حکمت عملی کا کچھ زیادہ ماہر نہیں ہوں۔ اس وجہ سے میرے لیے یہ فیصلہ کرنا سخت مشکل ہے کہ اعلام الموقعین کی ایک فصل کا منتخبہ کر کے بغیر کسی مقدمہ و تمہید کے اس کو اس طرح پیش کرنے میں کیا رموز و اسرار پوشیدہ ہیں۔ اس فصل کے بعض مطالب کو پرویز صاحب اور ان کے ہم مشرب لوگ بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ پچھلے دنوں بعض مخلصین کی طرف سے یہ تقاضا بھی کیا گیا تھا کہ اس فصل میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں میں ایک مضمون میں ان کا صحیح محمل بیان کر دوں۔ میں نے اس چیز کی طرف محض اس خیال سے توجہ نہیں کی کہ پرویز صاحب کی نقل و روایت کی بنا پر حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کوئی غلط فہمی شاید ہی کسی معقول آدمی کے اندر پیدا ہو سکے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ترجمان القرآن نے بھی حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کو اسی رنگ میں پیش کرنا شروع کر دیا ہے جس رنگ میں پرویز صاحب نے ان کی بعض باتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے تو یہ چیز مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا فتنہ بن سکتی ہے اور دین کے ایک حقیر خادم کی حیثیت سے مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بہت بڑی تہمت سے اور مسلمانوں کو ایک شدید قسم کے فتنہ سے بچانے کی کوشش کروں۔

اعلام الموقعین کی مذکورہ فصل پر میرا مفصل مضمون تو ان شاء اللہ میثاق کی آئندہ اشاعت میں آسکے گا لیکن اتنی گزارش پیش کر دینے کی گنجائش اس پرچے میں بھی ہے کہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس فصل میں یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی ہے کہ قائد تحریک اسلامی کو عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت شریعت کے حرام کو حلال کر دینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے بلکہ انھوں نے جو بات سمجھائی ہے وہ یہ ہے کہ شریعت کے احکام بہت سی قیدوں اور شرطوں کے ساتھ مقید ہیں۔ یہ قیدیں اور شرطیں یا تو خود شارع نے مقرر فرما دی ہیں یا خود ان احکام کی فطرت کے اندر مضمر ہیں اور اہل اجتہاد نے اپنے اجتہاد شرعی سے ان کو وضع کیا ہے۔ یہ قیدیں اور شرطیں تمام تر بندوں کے مصالح اور ان کی

ضروریات کی رعایت پر مبنی ہیں اس وجہ سے کسی شخص کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ ان قیدوں اور شرطوں سے بالکل مجرد کر کے ان احکام کو نافذ کرنے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو شارع کے منشا کے بالکل خلاف کرے گا۔

مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ چوری پر اسلامی شریعت میں قطع ید کی جو سزا ہے تو اس کے ساتھ متعدد قیدیں اور شرطیں لگی ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ چوری مال محفوظ کی گئی ہو، مال کی کم از کم اتنی مقدار چرائی گئی ہو جس پر چوری کا اطلاق ہو سکتا ہو، اس بات کے شبہ کی کوئی گنجائش موجود نہ ہو کہ چوری بربنائے اضطرار کی گئی ہے۔ یہ ساری شرطیں یا تو شارع نے نصوص میں واضح کر دی ہیں یا اہل اجتہاد نے شرعی اجتہاد کی روشنی میں متعین کی ہیں۔ اب اگر کوئی صاحب ان تمام قیود و شرائط کا لحاظ کیے بغیر ہر چوری پر قطع ید کی سزا نافذ فرمانے لگیں تو اس میں شبہ نہیں کہ وہ سخت غلطی کے مرتکب ہوں گے۔ لیکن ان سے بڑی غلطی کے مرتکب وہ صاحب ہوں گے جو ان قیود و شرائط کی آڑ لے کر یہ اصول بنا ڈالیں کہ ایک قائد تحریک اسلامی کو عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت حدود الٰہی کو معطل کر دینے کا حق حاصل ہے

اسی طرح حدود شرعیہ کے نفاذ کے لیے اسلامی شریعت میں دار الاسلام کی شرط ہے۔ یہ شرط خود شارع نے نصوص میں واضح کر دی ہے۔ اب اگر کوئی صاحب اپنے متشددانہ طرز فکر کی وجہ سے یہ مطالبہ کریں کہ جہاں کہیں بھی اور جن حالات کے اندر بھی کسی مستحق حد جرم کا ارتکاب کیا جائے، اس پر لازماً حد ہی جاری کی جائے تو ان کا یہ مطالبہ شرع شریف سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ لیکن اس سے بڑی ناواقفیت کا ثبوت وہ صاحب پیش کریں گے جو محض اس بنا پر کہ کسی شخص پر دار الحرب میں معروف حد جاری نہیں کی گئی یہ اصول بنا ڈالیں کہ عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت تمام حدود و تعزیرات کالعدم کی جا سکتی ہیں۔

اسی طرح کسی منکر کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا دین میں بہت بڑی نیکی ہے لیکن اس نیکی کے انجام دینے کے لیے دین میں بہت سی قیدیں اور شرطیں ہیں جو یا تو شارع نے بیان فرما دی ہیں یا خود اس کام کی نوعیت ان کا تقاضا کرتی ہے۔ ہر شخص جو کسی منکر کی اصلاح کے لیے اٹھے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی اصلاح منکر کی جدوجہد میں ان کو محفوظ رکھے ورنہ وہ دین کی کسی خدمت کے بجائے الٹا اپنے آپ کو بھی ایک فتنہ میں ڈال دے گا اور دین کے لیے بھی ایک فتنہ اٹھا کھڑا کرے گا۔ مثلاً ایک اسلامی حکومت کے حکمرانوں کے اندر خلاف شریعت باتیں پیدا ہونے لگیں تو ان کی اصلاح کی کوشش اہل علم اور اہل ایمان کے لیے نہایت اہم واجبات میں سے ہے لیکن ان کے خلاف بغاوت کے لیے شارع نے بہت سی شرطیں رکھی ہیں۔ یہ شرطیں نہایت تفصیل کے ساتھ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادی

ہیں۔ میں نے اپنی کتاب "اسلامی ریاست" میں یہ ساری شرطیں جمع کر دی ہیں۔ اب اگر کوئی صاحب اصلاحِ منکر کے جوش میں اٹھیں اور ان شرطوں کا لحاظ کیے بغیر حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کر ڈالیں تو ابن خلدون کے الفاظ میں وہ "مُوسوسین" یعنی خبطیوں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ لیکن ان سے بڑے خبطی وہ لوگ سمجھے جانے کے مستحق ہیں جو شارع کی مقرر کردہ شرائط اور عملی سیاست کے تقاضوں میں فرق نہ کریں اور ایک نیا اصول شریعت یہ گھڑ ڈالیں کہ عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت شریعت کے احکام میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح کی قیدیں اور شرطیں صرف انہی احکام کے ساتھ نہیں لگی ہوئی ہیں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے بلکہ دین کے سارے ہی احکام کے ساتھ کچھ نہ کچھ قیدیں اور شرطیں ہیں جو یا تو نصوص میں واضح ہوئی ہیں یا اجتہاد شرعی سے معین ہوئی ہیں۔ یہ تمام شرطیں اور قیدیں خود دین کے اجزا میں سے ہیں اور میں اپنے مضمون میں واضح الفاظ میں لکھ چکا ہوں کہ اقامتِ دین کی جد و جہد میں ان سے صرفِ نظر کرنا دین کی خدمت نہیں بلکہ دین کی تخریب ہے۔ وضو کے حکم کے ساتھ شرط ہے کہ پانی میسر ہو اور اس کے استعمال سے ضرر کا اندیشہ نہ ہو۔ نماز ایک خاص صورت و ہیئت کے ساتھ مطلوب ہے بشرطیکہ آدمی مریض یا مسافر یا حالتِ جہاد میں نہ ہو۔ روزہ واجبات دین میں سے ہے لیکن مسافر، مریض، پیر فانی اور حاملہ و مرضعہ کے لیے بہت سی رخصتیں ہیں۔ اسی طرح ہر حکم کے ساتھ شرائط و قیود ہیں۔ یہ شرائط و قیود خود شارع نے مقرر فرمائے ہیں اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ ان کو نظر انداز کر کے بندوں کے مصالح اور ان کی ضروریات کا خون کرے۔ لیکن یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ یہ شرطیں نہ کسی قائد صاحب کو عاید کرنے کا حق ہے اور نہ حکمتِ عملی کے تحت ان کو ان کے اندر کسی رد و بدل کا حق ہے۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مضمون میں اسلامی شریعت کی یہی حقیقت دکھانی چاہی ہے اور ان کے پیشِ نظر وہ لوگ ہیں جو اپنے غلو اور تشدد کے سبب سے ان قیود و شرائط کو یا تو نظر انداز کر دینے کا رجحان رکھتے ہیں یا اپنی کم علمی کے سبب سے ان سے واقف ہی نہیں ہیں۔ اگر صاحب ترجمان القرآن، ترجمان کے صفحات میں حافظ ابن قیمؒ کے مضمون کو نقل کر کے یہی بات دکھانی چاہتے ہیں کہ دین کے احکام مقید بشرائط و قیود ہیں اور ان شرائط و قیود کا لحاظ ضروری ہے تو یہ بات سمجھانے کے لیے انھیں یہ زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی، یہاں کوئی بھی نہیں ہے جس پر ان کی اس کوشش سے پہلے سے یہ حقیقت واضح نہ ہو۔ اور اگر وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ان پر اپنے موقف کی غلطی واضح ہو گئی ہے اور اب ان کا موقف حکمتِ عملی کے تحت دین میں رد و بدل سے ہٹ کر صرف دین میں حکمت و ضرورت کے اعتراف تک محدود رہ گیا ہے تو انھیں یہ نیک کام توریہ کے انداز میں کرنے کے بجائے واضح الفاظ میں کرنا چاہیے تاکہ

باقی ص ۲۵ پر

تدبرِ قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سُورۂ فاتحہ

(۲)

۴ - سُورہ کا استدلالی پہلو

یہ سورہ چونکہ دُعا کے اسلوب میں ہے اس وجہ سے اس میں استدلال کا پہلو واضح نہیں ہے لیکن اس میں جن باتوں کا بندے کی طرف سے اقرار کیا گیا ہے اور پھر جس بات کی درخواست کی گئی ہے، ان میں سے ہر چیز نہایت مضبوط عقلی اور فطری دلیل پر قائم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک دعا تو ہماری زبان سے کہلا دی گئی ہو جس کے اندر ہماری طرف سے نہایت اہم اعترافات بھی موجود ہوں لیکن نہ تو ان اعترافات ہی کے لیے کوئی عقلی بنیاد ہو اور نہ اس درخواست ہی کے لیے۔ اس دعا کے اندر استدلال کے جو پہلو ہیں اب یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان کو واضح کرتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلے اس امر کا اقرار ہے کہ شکر کا حقیقی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس اقرار کی بنیاد خدا کی پروردگاری، اس کی رحمانیت، اس کی رحیمیت اور اس کے عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدہ پر ہے جو ہمارے اندر بھی موجود ہیں اور جو اس کائنات کے بھی ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی کا بچہ ہو یا کسی حقیر سے حقیر حیوان کا، ابھی وہ دُنیا میں قدم بھی نہیں رکھتا ہے کہ اس کی پرورش کا سامان پہلے سے بالکل تیار موجود ہوتا ہے۔ اس سامان پرورش کی تیاری کا عالم یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کے تمام چھوٹے بڑے عناصر رات دن اسی کی فراہمی اور اسی کے اہتمام میں سرگرم ہیں۔ سورج بھی اسی کے لیے سرگرم ہے۔ چاند بھی اسی کے لیے مصروفِ کار ہے۔ ابر بھی اسی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے اور ہوا بھی ہر آن اسی کے لیے گردش میں ہے۔

پھر پرورش اور تربیت کا یہ اہتمام ہماری زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ میں نہیں پایا جا رہا ہے، بلکہ غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ یہ زندگی کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ ہمارے ظاہر کی بھی پرورش ہو رہی ہے، ہمارا باطن بھی زیر تربیت ہے۔

ہمارا جسم بھی پل رہا ہے ؛ ہماری عقل کو بھی غذا مل رہی ہے ، ہماری جسمانی قوتیں اور قابلیتیں بھی پروان چڑھ رہی ہیں اور ہماری روحانی صلاحیتوں کو بھی بالیدگی حاصل ہو رہی ہے ۔ غرض ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو نظر انداز ہو رہا ہو۔

اس تمام اہتمام و انتظام سے پرورش کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے ؟ کیا وہ اپنی سلطنت کے قیام و بقا کے لیے ہمارا محتاج ہے کہ وہ اس فیاضی کے ساتھ ہمارے اُوپر خرچ کرے ؟ کیا جس طرح بھیڑوں کے کسی گلے کا مالک یہ چاہتا ہے کہ اس کی بھیڑیں فربہ رہیں تاکہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ نفع کما سکے اسی طرح کی کوئی غرض اس جہان کے رب کے سامنے بھی ہے جس کے لیے وہ ہمیں کھلا پلا اور ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے ؟

انسان جب ان سوالوں پر غور کرتا ہے تو اسے صاف نظر آتا ہے کہ اس طرح کی کسی غرض کا کوئی ادنیٰ شائبہ یہاں دُور دُور تک فرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جس ذات کی قدرت و حکمت کا ادنیٰ کرشمہ یہ آسمان و زمین ہیں وہ بھلا ہم جیسے حقیر مُنگوں کی محتاج کیا ہو سکتی ہے ؟

اچھا، اگر یہ نہیں ہے تو کیا اس کائنات کے خالق و مالک پر ہمارا کوئی حق ہے ، جو پہلے سے قائم ہے اور جس کے سبب سے وہ مجبور ہے کہ ہمارے لیے یہ کچھ اہتمام وہ کرے ؟ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوئی چیز بھی فرض نہیں کی جا سکتی جن کو وجود کی نعمت ملی ہی محض اس کے لطف و کرم کی بدولت ہو وہ بھلا اس پر اپنا کوئی حق قائم کرنے کے قابل کس طرح ہو سکتے ہیں ؟

اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے اور صاف ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو اس کی اس تمام پروردگاری کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ رحمان اور رحیم ہے ۔ یہ اس کی رحمانیت کا جوش ہے کہ اس نے ہم کو وجود بخشا ۔ اور یہ اس کی رحیمیت کا فیض ہے کہ وہ برابر ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے ۔

انسان جب خدا کی پروردگاری کے اس اہتمام کو دیکھتا ہے تو یہیں سے اس پر علم و معرفت کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے ۔ یہ دروازہ ایک روزِ جزا و سزا کی آمد کا دروازہ ہے جس دن تنہا وہی پورے اختیار کے ساتھ انصاف کی کرسی پر بیٹھے گا ، اور نافرمانوں کو ان کی نافرمانیوں کی انصاف کے ساتھ سزا دے گا اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا فضل و رحمت کے ساتھ صلہ دے گا ۔

خدا کی پروردگاری اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی نشانیاں ایک روزِ جزا و سزا کی آمد کو کس طرح لازم کرتی ہیں ؟ اس سوال کا جواب تھوڑی سی وضاحت کا طالب ہے ۔

خدا کی پروردگاری سے روزِ جزا پر استدلال قرآن مجید نے جگہ جگہ اس طرح کیا ہے کہ جس خدا نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا ، اور آسمان کا شامیانہ تانا جس نے تمہارے لیے سورج اور چاند چمکائے جس نے ابر و ہوا

جیسی چیزوں کو تمہاری خدمت میں لگایا ، جس نے تمہارے تمام ظاہری اور باطنی ، روحانی اور مادی مطالبات کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا ، کیا اس خدا کے متعلق تم یہ گمان کرتے ہو کہ بس اس نے تمہیں یوں ہی پیدا کر دیا ہے اور پیدا کر کے بس یوں ہی چھوڑ دے گا ؟ یہ تمام کارخانہ محض کسی کھلنڈرے کا ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی غایت و مقصد نہیں ہے ؟ تم ایک شترِ بے مہار کی طرح اس سرسبز و شاداب چراگاہ میں بس چرنے کے لیے چھوڑ دیئے گئے ہو ، نہ تم پر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ تم سے کوئی پرسش ہوگی ؟ اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے تو نہایت غلط سمجھ رکھا ہے ۔ پرورش کا یہ سارا اہتمام پکار پکار کر شہادت دے رہا ہے کہ یہ اہتمام کسی اہم غایت و مقصد کے لیے ہے ، اور یہ ان لوگوں پر نہایت بھاری ذمہ داریاں عائد کرتا ہے جو بغیر کسی استحقاق کے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔ ایک دن ان ذمہ داریوں کی بابت ایک ایک شخص سے پرسش ہوگی اور وہی دن فیصلہ کا دن ہوگا ۔ جنھوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کی ہوں گی وہ سرخرو اور فائز المرام ہوں گے اور جنھوں نے ان کو نظر انداز کیا ہوگا وہ ذلیل اور نامراد ہوں گے ۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے لیکن ہم اختصار کے خیال سے صرف ایک مثال نقل کرتے ہیں :-

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا وَّالْجِبَالَ
أَوْتَادًا وَّخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا وَّجَعَلْنَا
نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَّ
جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا
شِدَادًا وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝ وَّ
أَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا
لِّنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝ وَّجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝
إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝

(نباء ۳-۱۵)

کیا ہم نے زمین کو تمہارے لیے گہوارہ نہیں بنایا اور اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں ٹھونکیں ؟ اور ہم نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ۔ اور تمہاری نیند کو دافعِ کلفت بنایا ۔ رات کو تمہارے لیے پردہ پوش بنایا ۔ اور دن کو حصولِ معاش کا وقت ٹھہرایا ۔ اور ہم نے تمہارے اُوپر سات مضبوط آسمان بلند کیے اور روشن چراغ بنایا ۔ اور ہم نے بدلیوں سے دھڑا دھڑ پانی برسایا تاکہ اس سے ہم غلے اور نباتات اگائیں اور گھنے باغ پیدا کریں ۔ بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے ۔

" بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے " یعنی اوپر جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ جس نے یہ کچھ اہتمام انسان کے لیے کیا ہے وہ انسان کو یوں ہی شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ اس کی نیکی یا بدی کے فیصلہ کے لیے فیصلہ کا ایک دن بھی لائے گا ۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ قرار دیا ہے کہ ایک ایسا دن وہ ایسا لائے جس میں

اچھوں اور بروں کے درمیان انصاف کرے، نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے، اور بدکاروں کو ان کی برائیوں کی سزا دے۔ ایک رحمان اور رحیم ہستی کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ظالم اور مظلوم، نیکوکار اور بدکار، باغی اور وفادار دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے، ان کے درمیان ان کے اعمال کی بنا پر کوئی فرق نہ کرے۔ نہ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دے اور نہ مظلوم کی مظلومیت کا ظالم سے انتقام لے۔ اگر زندگی کا یہ کارخانہ اسی طرح ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد جزا و سزا اور انعام و انتقام کا کوئی دن آنا نہیں ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ العیاذ باللہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں متقی اور مجرم دونوں برابر ہیں۔ بلکہ مجرم نسبتۃً اچھے ہیں جن کو جرم کرنے اور فساد برپا کرنے کے لیے اس نے بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ یہ چیز بداہتہً غلط اور اس کے رحمان اور رحیم ہونے کے بالکل منافی ہے چنانچہ اس نے نہایت واضح الفاظ میں اس کی تردید فرمائی ہے۔ مثلاً:

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ (۳۶۔ قلم)
کیا ہم اطاعت کرنے والوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے، تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

اور اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ بتایا ہے کہ ایک دن وہ سب کو جمع کر کے انصاف کرے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے:-

كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ (۱۲۔ انعام)
اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر لی ہے۔ وہ قیامت تک جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، تم کو ضرور جمع کرے گا۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ قیامت دراصل خدا کی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے اس وجہ سے وہ فیصلہ کا ایک دن ضرور لائے گا جس میں وہ سب کو اکٹھا کر کے ان کے درمیان انصاف فرمائے گا۔ اور یہ بھی عین اس کی اس رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ اس دن کسی کی مجال نہ ہوگی کہ اس کے فیصلوں میں کوئی مداخلت کر سکے اور اپنی سفارشوں سے حق کو باطل یا باطل کو حق بنا سکے بلکہ ہر ایک کے لیے بالکل بے لاگ اور دو ٹوک انصاف ہوگا۔

اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہوا کہ عدل اور رحمت میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ عدل عین رحمت ہی کا تقاضا ہے۔

ربوبیت، رحمت اور عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدہ سے اللہ تعالیٰ کے لیے شکر کا بے پایاں جذبہ جو پیدا ہوتا ہے، یہی جذبہ ہے جو بندہ کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرے اور اپنی ہر مشکل میں اسی سے مدد مانگے۔ غور کیجئے تو صاف واضح ہوگا کہ جس طرح یہ جذبہ رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کے مشاہدہ کا ایک فطری نتیجہ ہے

اسی طرح اس جذبہ سے سرشار ہو کر بندہ کا خدا کی طرف اس کی عبادت کے لیے بڑھنا بھی اس جذبہ کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے۔ انسان کا ہر جذبہ اپنا ایک قدرتی ردِ عمل رکھتا ہے۔ اس جذبہ کا، جو اپنے منعم حقیقی کی شکر گزاری کے لیے انسان کے اندر ابھرتا ہے، قدرتی ردِ عمل یہ ہے کہ وہ اسی کی بندگی کرے اور اسی سے مدد مانگے۔ جو ذات اس فیاضی اور اس اہتمام کے ساتھ پرورش کر رہی ہے جس کی یہ پروردگاری نہ اس کی طرف سے کسی غرض پر مبنی ہے اور نہ ہماری طرف سے کسی استحقاق پر بلکہ تمام تر اس کی رحمانیت اور رحیمیت کا فیضانِ عام ہے پھر جس کی ربوبیت اور رحمانیت صرف اس حیاتِ چند روزہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس زندگی کے بعد بھی اپنے نیک بندوں کے لیے اس نے ابدی زندگی کی مسرتیں محفوظ کر رکھی ہیں، اس کے سوا کون ہے جو انسان کی حقیقی شکر گزاری کا مستحق ہو سکے۔ اور اگر وہی ہمارے حقیقی شکر کا سزاوار ہے تو پھر اس کے سوا کون ہے جو اس بات کا حق دار ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں اور اس سے مدد مانگیں؟

اس طرح شکر کا جذبہ گویا دھکیل کر بندے کو اس کے منعم حقیقی کے دروازے پر ڈال دیتا ہے کہ وہ اسی کی بندگی کرے اور اسی سے طالبِ مدد ہو۔ اس حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ درحقیقت شکر کے جذبہ سے بندہ کے اندر خدا کی عبادت کا داعیہ ابھرتا ہے اور پھر اسی جذبہ اور اسی کے قدرتی ردِ عمل سے دین کی داغ بیل پڑتی ہے۔

اس کائنات میں اور خود اپنے وجود کے اندر خدا کی ربوبیت اور اس کی رحمت کے بے شمار آثار دیکھ کر انسان کے اندر اپنے منعم حقیقی کے لیے شکر کا جذبہ اور اس جذبہ کی تحریک سے انسان کے اندر اس کی عبادت کرنے کا ولولہ پیدا ہونا ایک ایسی بات ہے جو ہر پہلو سے بالکل ایک فطری اور بدیہی حقیقت معلوم ہوتی ہے کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس واضح حقیقت کا انکار کر سکے۔

لیکن مذہب دشمنی کے اندھے جوش میں فلسفۂ جدید کے مدعیوں نے دین کے آغاز سے متعلق اس سے بالکل مختلف نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر سب سے قدیم اور ابتدائی جذبہ خوف کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ ان ہولناک اور خوفناک حوادث کے مشاہدہ سے پیدا ہوا جو اس دنیا میں طوفانوں، زلزلوں اور وباؤں کی صورت میں آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔ اس خوف کے جذبہ نے انسان کو ان اندیکھی طاقتوں کی پرستش پر مجبور کیا جن کو اس نے ان حوادث کا پیدا کرنے والا خیال کیا۔ اور اس طرح انسان نے شرک سے دین کا آغاز کیا۔

ہم اس غلط نظریہ کی تردید اپنی ایک دوسری کتاب[1] میں پوری تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ یہاں ہم صرف اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ مذہب کے آغاز سے متعلق قرآن کی یہ تقریر زیادہ دل نشین اور عقل و فطرت کے مطابق ہے یا فلسفۂ جدید کا یہ نظریہ زیادہ قرینِ عقل و فطرت ہے؟ اس دنیا کے عام واقعات زلزلے، طوفان اور سیلاب ہی ہیں یا اس کی

[1] ملاحظہ ہو ہماری کتاب "حقیقتِ شرک"

بہاریں بھی آتی ہیں، چاندنی بھی پھیلتی ہے، بارشیں بھی ہوتی ہیں، تارے بھی چھٹکتے ہیں، پھول بھی کھلتے ہیں اور فصلیں بھی پکتی ہیں؟ ہمارے عام مشاہدے میں زیادہ تر ربوبیت کی یہ برکتیں اور رحمت کی یہ شانیں آتی رہتی ہیں یا صرف زلزلوں اور طوفانوں کی ہولناکیاں ہی آتی ہیں؟ اس کائنات اور خود اپنی فطرت کے عجائب پر نگاہ ڈالنے کے بعد انسان پر ان دیکھی طاقتوں کا ہول طاری ہوتا ہے یا ایک رحمان و رحیم اور منعم و دیان خدا کے احسانات کے احساس سے دل کا ریشہ ریشہ لبریز ہو جاتا ہے؟ جو شخص بھی ان سوالوں پر ضد اور ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر غور کرے گا اور بے کم و کاست اپنے سچے تاثر کا اظہار کرے گا وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی عقل اور انسانی فطرت کے بہاؤ کا اصل رخ وہی ہے جس کا پتہ قرآن مجید دے رہا ہے، نہ کہ وہ جس کی طرف فلسفہ جدید لے جا رہا ہے۔

یہ نظریہ بھی بدیہی طور پر غلط معلوم ہوتا ہے کہ خوف کا جذبہ تمام دوسرے جذبات سے مقدم ہے۔ خوف کا تجزیہ کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ خوف نام ہے اس چیز کا کہ آپ کو کسی ایسی چیز کے چھن جانے یا اس سے محروم ہو جانے کا اندیشہ یا خطرہ پیدا ہو گیا ہے جو آپ کو حاصل بھی ہے اور جو عزیز بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خوف سے پہلے کسی نعمت کا شعور لازمی چیز ہے۔ اور جب نعمت کا شعور پایا گیا تو ایک مُنعم کا شعور بھی لازمی ہوا، اور پھر اس کی شکرگزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔ انسان کے مشاہدۂ کائنات اور مشاہدۂ نفس کی فطری راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نعمتوں اور رحمتوں کے مشاہدہ سے اس پر ایک مُنعم حقیقی کی شکرگزاری کا جذبہ اور احساس طاری ہوا اور پھر اس جذبہ کی تحریک سے وہ اس کی بندگی کی طرف مائل ہوا۔ رہا یہ سوال کہ اس صحیح شاہراہ پر ایک مرتبہ پڑ جانے کے بعد وہ دوسری غلط راہوں کی طرف کس طرح مڑ گیا تو اس کا سبب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کی فطرت میں کوئی خرابی موجود تھی جو اس گمراہی کا سبب بنی، بلکہ اس میں یا تو اختیار و ارادہ کے سوءِ استعمال کو دخل ہے یا عقل کی کج روی اور ہوا پرستی کو۔ اس مسئلہ پر بھی مفصل بحث ہم دوسری جگہ کر چکے ہیں[1]۔

اقرارِ بندگی اور اظہارِ اعتماد و توکل کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دعا ہمارے سامنے آتی ہے اور اسی دعا پر جو اس تمام تمہید کے بعد اصل حرفِ مدعا کی حیثیت رکھتی ہے، یہ سورہ ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مغضوبوں اور گمراہوں کی روش سے اظہارِ بیزاری کا جو مضمون ہے وہ منفی پہلو سے اسی دعا کی توضیح مزید ہے۔

۵ - رسالت کی ضرورت پر ایک دلیل

اوپر کی ساری تمہید کا اقرار و اعتراف کی شکل میں نمایاں ہونا اور اھدنا الصراط المستقیم کا دعا کی شکل میں سامنے آنا ایک خاص حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کا تعلق ہے

[1] ملاحظہ ہوں ہمارے رسائل "حقیقتِ شرک" اور "حقیقتِ توحید"

جہاں تک ان نشانیوں کے مشاہدہ سے شکر کے جذبہ کے ابھرنے کا تعلق ہے اور پھر اس جذبۂ شکر کی تحریک سے جہاں تک اس منعم حقیقی کی بندگی اور اسی سے طلب اعانت کے ارادہ کا تعلق ہے یہ باتیں ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ ان کو ہر انسان محسوس کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے دل پر پردہ نہ پڑا ہو۔ اگر انسان اپنی عقل اور اپنی فطرت کو ان کی اپنی روش پر کام کرنے دے، غیر فطری اڑنگے ان کی راہ میں نہ ڈالے تو وہ ان باتوں میں سے کسی بات کے اقرار و اعتراف میں بھی تامل نہیں کرے گا، یہاں تک کہ ایک روزِ جزا کی آمد میں بھی اس کو شبہ نہیں ہوگا۔ البتہ اگر وہ رکے گا تو اس مقام پر آ کے رکے گا کہ جس خدا کی وہ بندگی کرنا چاہتا ہے اور اپنی ہر مشکل میں جس کی مدد پر اس نے بھروسہ کیا ہے اس تک پہنچنے کا، اس کی عبادت کرنے کا، اس کی پسند اور ناپسند معلوم کرنے کا اور زندگی کی ہر مشکل میں اس سے مدد مانگنے کا صحیح طریقہ اور سیدھا راستہ کیا ہے؟ اسی صحیح راستہ کو معلوم کرنے کے لیے بندہ اللہ تعالیٰ سے اھدنا الصراط المستقیم کی دعا کرتا ہے۔

اس بات کو صریح دعا کے اسلوب میں کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یہاں انسان کی اپنی عقل اور سمجھ بالکل عاجز ہے، صرف خدا ہی ہے جو بتا سکتا ہے کہ صراطِ مستقیم کیا ہے اور وہی ہے جو اس صراطِ مستقیم کو اختیار کر لینے کے بعد اس پر جمے رہنے کی توفیق بخش سکتا ہے۔ یہیں سے انسانی فطرت کے اندر وہ خلا نمایاں ہوتا ہے جس کے سبب سے وہ نبوت اور رسالت کا محتاج ہوا ہے۔ انسان اگر کج فہمی سے کام نہ لے تو آفاق اور انفس کی نشانیوں سے وہ یہ تو معلوم کر سکتا ہے کہ ایک خدا ہے، وہ پرورش کرنے والا اور مہربان ہے اور وہ جزا اور سزا دینے والا بھی ہے لیکن یہ معلوم کرنا اس کے بس میں نہیں ہے کہ اس خدا کی بندگی اور اطاعت کا طریقہ کیا ہے۔ یہی طریقہ بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا ہے۔

۶ - سورہ پر دعا کے پہلو سے ایک نظر

دعا کے پہلو سے اس سورہ کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے تنہا یہی بات کافی ہے کہ یہ سورہ ہماری سب سے بڑی عبادت — نماز — کی خاص سورہ ہے۔ صحیحین کی مشہور روایت ہے کہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب اس شخص کی نماز نہیں ہے جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔

پھر اپنی تاثیر کے لحاظ سے اس کا جو درجہ ہے اس کا اندازہ اس حدیث قدسی سے ہوتا ہے جو مسلم میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ جب پورے شعور اور اخلاص کے ساتھ نماز میں اس سورہ کی تلاوت کرتا ہے تو اس کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے ساتھ ہی خدا کے ہاں شرفِ قبولیت پاتا ہے۔ حدیث ملاحظہ ہو۔

عن ابی هریرة عن رسول الله صلی الله ... ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں

علیه وسلم یقول الله تعالیٰ قسمت الصلوٰة بینی و بین عبدی نصفین فنصفها لی و نصفها لعبدی ولعبدی ما سأل اذا قال العبد الحمد لله رب العالمین قال الله حمدنی عبدی واذا قال الرحمن الرحیم قال الله اثنی علی عبدی فاذا قال مالک یوم الدین قال الله مجدنی عبدی واذا قال ایاک نعبد وایاک نستعین قال هذا بینی و بین عبدی ولعبدی ما سأل فاذا قال اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین قال هذا لعبدی ولعبدی ما سأل.

کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندہ کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا نصف حصہ میرے لیے ہے اور نصف میرے بندہ کے لیے ہے اور میرے بندہ کو وہ بخشا گیا جو اس نے مانگا۔ جب بندہ الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اور جب وہ الرحمن الرحیم کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف بیان کی اور جب وہ مالک یوم الدین کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی اور جب بندہ ایاک نعبد وایاک نستعین کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں نے اپنے بندہ کو وہ بخشا جو اس نے مانگا۔ پھر جب بندہ اہدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے مانگا۔

اس حدیث میں اس سورہ کا جو حقیقت افروز اور معنی خیز تجزیہ ہے وہ بجائے خود اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے اس پہلو پر ہم غور کرنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے اس کے لفظ لفظ کے اندر یہ تاثیر بھر دی ہے کہ بندے کی زبان سے لفظ ابھی نکلا نہیں کہ بارگاہ رب العزت سے اس کی سند قبولیت اس کو عطا ہو گئی۔ دعائیں اور بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہیں لیکن شاذ ہی کسی دعا کے متعلق اس تفصیل سے بتایا گیا ہو کہ اس کے ایک ایک لفظ کا خود اس ذات پر کیا اثر پڑتا ہے جس سے یہ دعا کی جاتی ہے اور کن لفظوں میں وہ اس کو قبول فرماتا ہے۔

اس دعا کی اس غیر معمولی اہمیت اور عظمت کے سبب سے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی بعض خوبیاں ہم یہاں واضح کریں۔ اگرچہ توقع نہیں کہ اس کی خوبیوں اور بلاغتوں کا عشر عشیر بھی ہم بیان کرنے پر قادر ہو سکیں گے۔

اس دعا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جس چیز کے لیے دعا کی گئی ہے اس سے اعلیٰ اور اس سے برتر کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں بندہ خدا سے خود اسی تک پہنچنے اور اسی کو پانے کے سیدھے راستہ کی ہدایت مانگتا ہے۔ یہ دعا اوّل تو ہر شائبہ نفس سے پاک ہے۔ ثانیاً یہ عین اس مقصد کے لیے دعا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ ثالثاً یہ ایک ایسے معاملہ میں خدا سے رہنمائی کی دعا ہے جس میں انسان کی اپنی عقل، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے، بالکل عاجز و درماندہ ہے۔ صرف خدا ہی کی رہنمائی سے وہ اسے پا بھی سکتا ہے اور اسی کی توفیق سے اسے پا کر اس پر قائم بھی رہ سکتا ہے۔ اس وجہ سے جب بندہ یہ چیز اپنے رب سے مانگتا ہے تو ایک ایسی چیز مانگتا ہے جو فی الحقیقت مانگنے کی بھی ہے اور تنہا اسی سے مانگنے کی ہے۔

دوسری چیز اس دعا کی تمہید ہے جو ہر پہلو سے ایک ایسی تمہید ہے جس سے بہتر تمہید کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کریم کے دروازے سے سائل کو سب کچھ مل سکتا ہے بشرطیکہ مانگنے کا طریقہ صحیح ہو۔ اس تمہید کے بعض پہلوؤں پر نگاہ ڈالیے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا آغاز اعتراف شکر سے ہوا ہے۔ شکر کا حقیقی سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اور یہ شکر ہی وہ چیز ہے جس سے بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مستحق قرار پاتا ہے اور جتنا ہی اس میں ترقی کرتا جاتا ہے اسی حساب سے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۔ ۳۵ ۔ قمر (یہ ہماری طرف سے فضل ہوا۔ اور ایسا ہی ہم بدلہ دیتے ہیں ان لوگوں کو جو ہمارے شکر گزار رہتے ہیں) دوسری جگہ ارشاد ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ۔ ۷ ۔ ابراہیم۔ (اگر تم میرے شکر گزار رہو گے تو میں تمہارے لیے اپنی نعمتوں میں اضافہ کرتا رہوں گا)

دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جن صفتوں کے توسل سے یہ دعا کی گئی ہے وہ دوسری تمام صفات کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہیں۔ اس وجہ سے اس دعا میں گویا اللہ تعالیٰ کے سارے ہی اسمائے حسنیٰ کا سہارا حاصل کر لیا گیا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں کامل سپردگی اور کامل توکل کا اظہار ہے۔ بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے دروازے پر ڈال دیتا ہے۔ اس دروازے کے سوا اس کے لیے اور کوئی دروازہ نہیں۔ بس ایک ہی ہے جس کی وہ بندگی کرتا ہے۔ اور ایک ہی ہے جس سے وہ مدد کی درخواست کرتا ہے۔ جب اس طرح ساری دنیا سے کٹ کر بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دے گا تو آخر اس کی دعا کا ایک ایک حرف کیوں نہ شرف قبولیت پائے گا۔

اس دعا کے خاتمہ پر بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی اس کی قبولیت کے لیے ایک بہترین سفارش فراہم کرتا ہے۔ یہاں جس صراط مستقیم کی ہدایت کی دعا کی گئی ہے: اوّل تو اس کے لیے جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے وہی اس طلب کے لیے بندے کے ذوق و شوق کا پورا پورا اظہار کر رہا ہے کیوں کہ اِھْدِنَا کا مفہوم، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا راستہ بتا دے۔ بلکہ یہ بات بھی اس اسلوب میں چھپی ہوئی ہے کہ اس راستہ کے لیے ہماری آنکھیں کھول دے، اس پر چلنے کا ہمیں شوق اور ولولہ عطا فرما، ہمارے دلوں میں اس کی محبت جاگزیں کر دے اور اسی پر ہمیں جینے کی توفیق دے اور اسی پر مرنے کی سعادت نصیب کر۔ ثانیاً اس کی مزید وضاحت ایسے الفاظ سے کی گئی ہے جن سے ان لوگوں کے ساتھ بندے کی محبت کا اظہار ہوتا ہے جو اس راستے پر جیے اور مرے ہیں۔ اور ان لوگوں سے انتہائی بیزاری کا اظہار ہے جنھوں نے شرارت یا حماقت کے سبب سے اس سے انحراف اختیار کیا ہے۔

اس دعا کی بے شمار بلاغتوں میں سے یہ چند باتیں ہیں جن کی طرف اجمالی طور پر ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اس سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ دعا نماز کی مخصوص دعا کیوں قرار دی گئی۔ اور کیوں یہ بات ہے کہ زبان سے نکلتے ہی اس کا لفظ لفظ شرف قبولیت حاصل کرتا ہے۔ ایک طرف دعا کے ان الفاظ کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف نماز کی مخصوص حیثیت اور اس کے مخصوص آداب کو ملحوظ رکھیے پھر تصور کیجیے کہ کتنی بہترین دعا ہے اور اس کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کتنا بہترین طریقہ بھی سکھایا ہے۔

۷۔ سورہ پر دیباچۂ قرآن ہونے کی حیثیت سے ایک نظر

اس سورہ کو قرآن مجید کی ترتیب میں بھی دیباچۂ قرآن کی جگہ دی گئی ہے اور حدیثوں میں بھی اس کے جو مختلف نام آئے ہیں ان سے بھی اس کی یہی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً اس کو فاتحۃ الکتاب کہا گیا ہے جس کے صاف معنی دیباچۂ قرآن کے ہیں۔ اسی طرح اس کے لیے ام الکتاب یعنی مغز قرآن کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، جو پہلے لفظ سے بھی زیادہ اس کی اہمیت کو واضح کرنے والا ہے۔ کافیہ اور واقیہ بھی اس کے نام ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورہ اپنے اندر تمام قرآنی مطالب کو سمیٹے ہوئے ہے۔ مختصراً ہم سورہ کے اس پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک تین وجوہ سے اس سورہ کو دیباچۂ قرآن ہونے کا مرتبہ حاصل ہوا ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس سورہ میں دین اور شریعت کے نقطۂ آغاز کا پتہ دیا گیا ہے۔ یہ سورہ ہمیں بتاتی ہے کہ خدا پرستی کا اولین محرک کیا ہے، یہ محرک کن حالوں کا نتیجہ ہے۔ اس تحریک سے انسان خدا پرستی کی راہ میں پہلا قدم کیا اٹھاتا ہے اور اس قدم کے بعد اس کے

اندر اصلی طلب و جستجو کس چیز کے لیے پیدا ہوتی ہے۔

ہر شخص یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ جس سورہ میں مذکورہ سوالوں کا جواب دیا گیا ہو وہی سورہ اپنے مضمون کے لحاظ سے دیباچۂ قرآن کی جگہ پانے کے لیے موزوں ترین سورہ ہے۔

اب آئیے ان اشارات کی روشنی میں، جو اوپر گزر چکے ہیں، یہ دیکھیے کہ یہ سورہ ان سوالوں کا کیا جواب دیتی ہے۔

یہ سورہ بتاتی ہے کہ آفاق اور انفس کے اندر خدا کی ربوبیت، اس کی رحمانیت اور رحیمیت اور اس کے عدل کی جو نشانیاں موجود ہیں وہ انسان کے اندر خدا کے شکر کا جذبہ ابھارتی ہیں۔ یہ جذبہ ایک زوردار محرک ہے کہ انسان کو خدا کی عبادت اور اسی سے استعانت کے لیے اکساتا ہے۔ اس کے بعد انسان میں اس سیدھے راستہ کی طلب و جستجو پیدا ہوتی ہے جو اس کو خدا تک پہنچائے۔ انسان کی اس طلب و جستجو کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبوت اور رسالت کا نظام قائم فرمایا اور اپنی ہدایت و شریعت نازل فرمائی۔ مذہب کی راہ میں انسان کا فطری ارتقا اسی طرح ہوا ہے اور اس سورہ میں یہ حقیقت چونکہ نہایت اجمال اور نہایت خوبی کے ساتھ واضح ہوئی ہے اس وجہ سے اس کو دیباچۂ قرآن کی جگہ ملی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں اگر ان کو سمیٹا جائے تو وہ تین عنوانوں کے تحت جمع کیے جا سکتے ہیں۔ توحید، قیامت، رسالت۔ یہ سورہ ان تینوں عنوانوں پر بنیادی رہنمائی دیتی ہے۔ اس وجہ سے اس نے گویا قرآن کے سارے علوم کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اس کی ابتدائی دو آیتوں میں خدا ہی کا تمام عالم کا مالک اور آقا ہونا اور تمام حمد و شکر کا سزاوار ہونا بیان ہوا ہے۔ اس کی تیسری آیت میں ایک روز جزا و سزا کی آمد کی طرف بھی اشارہ ہے اور ساتھ ہی اس میں توحید کا مضمون بھی شامل ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا بھی کوئی زور اور اختیار نہیں چلے گا۔ اس کی چوتھی آیت میں بندہ اپنے آپ کو بالکل اپنے رب کے حوالے کر دیتا ہے اور یہی توحید کی اصلی حقیقت ہے۔ پانچویں آیت میں اصل دعا ہے اور اس دعا ہی سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی سیدھی راہ معلوم کرنے کے لیے نبوت و رسالت کے سلسلہ اور اس کی نازل کردہ ہدایت و شریعت کا محتاج ہے۔ نیز اسی بحث میں یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہے کہ خدائی شریعت پانے کے بعد کسی قوم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور اس کی قدر کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کیا معاملہ کرتا ہے۔ غرض اس سورہ کے اندر دین کے تمام بنیادی عناصر جمع ہیں۔ اگر ان کی تفصیل کر دی جائے تو دین کا پورا نظام کھڑا ہو جاتا ہے۔ گویا ان چند آیتوں کے اندر پورا قرآن عظیم بند ہے اور اس چھوٹے سے نگینہ کے اندر معانی و حقائق کا وہ پورا شہرستان دکھا دیا گیا ہے جو قرآن کے

تیس پاروں کے اندر پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کو سبع مثانی کہنے کی یہی وجہ ہے اور اگر کوئی اور وجہ نہ بھی ہوتی تو تنہا یہی وجہ اس بات کے لیے کافی تھی کہ یہ سورہ دیباچۂ قرآن کی جگہ پائے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے باطن کی یہی پیاس جو اس سورہ سے ظاہر ہوتی ہے، درحقیقت نزول قرآن کا سبب بنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت سے پہلے یہود اور نصاریٰ کو صراط مستقیم دکھائی تاکہ وہ خود بھی اس پر چلیں اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے کی دعوت دیں۔ لیکن وہ اس راہ پر نہ خود قائم رہے اور نہ دوسروں کے لیے انھوں نے اس کے نشانات باقی رہنے دیئے۔ اس راہ حق کو گم کر کے انھوں نے دنیا کو جاہلیت کے اندھیرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ سورہ اسی اندھیرے سے نکلنے کی دعا ہے۔ اور ایک ایسی دعا ہے جو فطرت انسانی کی گہرائیوں سے نکلی ہے۔ یہی دعا ہے جس کی برکت سے دنیا کو قرآن کی روشنی ملی اور جاہلیت کی تاریکی سے نکلنا نصیب ہوا۔ اور یہی دعا ہے جو قرآن کے فہم و تدبر اور اس سے زندگی کے مسائل میں رہنمائی حاصل کرنے کے معاملہ میں بھی ہمارے قدم کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھ سکتی ہے۔ اس پہلو سے بھی یہ سورہ دیباچۂ قرآن بننے کے لیے نہایت موزوں تھی۔

۸۔ سورہ کا تعلق بعد کی سورہ سے

پورے قرآن سے اس سورہ کا جو تعلق ہے، وہ اوپر کی بحث سے اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔ اب ہم اس کا تعلق بعد کی سورہ (سورہ بقرہ) سے واضح کرنا چاہتے ہیں۔

سورہ فاتحہ کے آخری حصہ اور سورہ بقرہ کی پہلی آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں سورتوں میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایک دعا اور اس کے جواب یا ایک دعا اور اس کے اثر اور اس کی قبولیت میں ہوتا ہے۔ سورہ فاتحہ کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت دے، ان لوگوں کے راستہ کی جن پر تو نے انعام کیا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ) اس کے معاً بعد سورہ بقرہ اس طرح شروع ہوتی ہے۔ الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (الٓمّٓ۔ یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ خدا ترسوں کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے) گویا سورہ فاتحہ میں جس اصل ہدایت و رہنمائی کے لیے دعا کی گئی تھی، سورہ بقرہ میں وہ ہدایت سامنے آگئی۔ ایک صاحب ذوق جب دعا کے فوراً بعد اس کے اس اثر اور نتیجہ کو سامنے موجود دیکھتا ہے تو اس کی روح خدا کے شکر کے جذبہ سے سرشار ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور پہلو بھی سامنے رکھنا چاہیے، وہ یہ کہ سورۂ فاتحہ میں منعم علیہم گروہ کے راستہ کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ

مغضوب اور گمراہ گروہوں کے طریقوں سے بچائے جانے کی بھی دعا ہے۔ دعا کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر جب آدمی سورۂ بقرہ کی تلاوت کرتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس سورہ میں ملت ابراہیمی کی تجدید کے ساتھ ساتھ یہود کے ان تمام جرائم کی فہرست بھی بیان ہوئی ہے جو انھوں نے خدا، اس کے نبیوں اور رسولوں اور اس کی شریعت کے خلاف کیے ہیں اور جن کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ٹھہرے کہ ان پر خدا کا غضب نازل ہو اور وہ قوموں کی امامت کے منصب سے معزول کیے جائیں۔ گویا سورہ فاتحہ میں جس انعام یافتہ اور اس کے بالمقابل جس مغضوب گروہ کی طرف ایک اجمالی اشارہ تھا سورۂ بقرہ میں ان دونوں گروہوں سے متعلق پوری تفصیل سامنے آگئی اور واضح ہو گیا کہ کن کی پیروی کرنی ہے اور کن کے طریقوں سے بچنا ہے۔

بالکل یہی صورت سورہ آل عمران کی ہے جو سورہ بقرہ کے بعد ہے۔ بقرہ میں جس طرح یہود کی شرارتوں کی تفصیل ہے اسی طرح آل عمران میں نصاریٰ کی بدعتوں اور ان کی گمراہیوں کی تردید کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس میں اس اسلام کی صحیح تصویر بھی پیش کی گئی ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیائے کرام بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام نے دی ہے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد ترتیب قرآن میں انہی دو بڑی سورتوں کا جگہ پانا اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں سورہ فاتحہ کی دعا کی مقبولیت اور اس کے آخری حصہ کے اجمالات کی شرح ہیں۔

میثاق
کے
ہندوستانی خریدار اپنے چندے
الفرقان لکھنؤ
یا
دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ
کے پاس جمع کرائیں
اور اس کی اطلاع ہمیں دیں
منیجر میثاق۔ رحمان پورہ، اچھرہ، لاہور

تزکیہ نفس

امین احسن اصلاحی

انفاق اور آفاتِ انفاق

اس مضمون کا کچھ حصہ بعض رسائل میں شائع ہو چکا ہے لیکن اپنی مکمل صورت میں یہ ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا ہے۔ میثاق میں یہ پورا دیا جا رہا ہے۔ (ایڈیٹر)

دنیا اور اسبابِ دنیا سے محبت کے سبب سے اللہ تعالیٰ سے جو غفلت ہوتی ہے اس کا سب سے زیادہ موثر اور کارگر علاج انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ ہم نے انفاق فی سبیل اللہ کی اصطلاح استعمال کی ہے، زکوٰۃ کی اصطلاح نہیں استعمال کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تزکیہ نفس اور احسان کے نقطۂ نظر سے دین میں جس چیز کی اہمیت ہے وہ انفاق کی ہے۔ صرف زکوٰۃ کی نہیں ہے۔ زکوٰۃ تو وہ کم سے کم مطالبہ ہے جو اسلام میں ایک صاحبِ مال سے کیا گیا ہے۔ اسلام کا اصل مطالبہ تو انفاق کے لیے ہے، جو سراً بھی ہو، علانیہ بھی ہو، تنگی میں بھی ہو، فراخی میں بھی ہو، دوست اور عزیز کے لیے بھی ہو مخالف اور دشمن کے لیے بھی۔

زکوٰۃ ادا کر دینے سے اسلامی حکومت کے مطالبہ سے تو آدمی ضرور بری ہو جاتا ہے، قانون اس پر کوئی گرفت نہیں کر سکتا۔ لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کے مطالبہ کا تعلق ہے وہ صرف زکوٰۃ ادا کر دینے سے پورا نہیں ہوتا بلکہ یہ اس وقت پورا ہوتا ہے جب آدمی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ناگزیر ضروریات کے سوا ہر مصرف سے اپنا مال بچا کر اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے جمع کرے۔ جو شخص اس اہتمام سے اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہی درحقیقت انفاق کا اصل حق ادا کرتا ہے اور وہی ہے جو اس زندگی میں روح کی بادشاہی کا جلوہ دیکھتا ہے اور آخرت میں اپنے رب کی خوشنودی کی جنت دیکھے گا۔

ہم پہلے یہاں مختصراً انفاق کی برکات پر گفتگو کریں گے۔ اس کے بعد ان آفات کا ذکر کریں گے جو انفاق کو باطل کر دیتی ہیں اور ساتھ ہی ان آفتوں سے اپنے انفاق کو محفوظ رکھنے کے لیے قرآن و حدیث میں جو تدبیریں بتائی گئی ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

انفاق کی برکات

اللہ تعالیٰ کے ساتھ حقیقی لگاؤ انفاق کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ یہ آدمی کے دل کو خدا کے ساتھ اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ اس کے لیے خدا سے غافل رہنا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے۔ آدمی کو مال سے جو محبت ہے اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ وہ جس جگہ اپنا مال رکھتا ہے یا جس کام میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے اسی جگہ یا اسی کام کے ساتھ اس کا دل بھی اٹکا رہتا ہے۔ اگر وہ اپنا مال کسی مخفی جگہ میں دفن کرتا ہے تو اس کا دل ہر وقت اسی گوشے اور اسی خرابے میں گردش کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ کسی بنک میں رکھتا ہے تو اس بنک کے ساتھ اس کا دل بندھ جاتا ہے۔ اگر کسی کاروبار، یا کسی کمپنی میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے تو رات دن اس کاروبار یا اس کمپنی کی فکر میں اس کے سر پر سوار رہتی ہیں۔ الغرض جہاں آدمی اپنا سرمایہ لگاتا ہے تجربہ شہادت دیتا ہے کہ وہیں اس کا دل بھی رہتا ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں دیکھیے تو یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص اپنا مال خدا کے راستے میں خرچ کرے گا اس کا دل بھی خدا ہی کے ساتھ رہے گا کیونکہ اس کا مال خدا ہی کے پاس ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ "تو اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھ کیونکہ جہاں تیرا مال رہے گا وہیں تیرا دل بھی رہے گا۔"

معاشرے کے ساتھ حقیقی ربط اس کی دوسری برکت یہ ہے کہ صاحبِ انفاق کا اپنے معاشرے کے ساتھ بھی صحیح ربط قائم ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ چیز بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ فلسفۂ شریعت کے اعتبار سے یہ دین کی دو بنیادوں میں سے دوسری ہے۔ ایک بندے کے صحیح بندہ بننے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ رب کے ساتھ اس کا حق بالکل ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے، دوسری یہ کہ خلق کے ساتھ وہ صحیح طور پر مربوط ہو جائے۔ پہلی چیز آدمی کو نماز سے حاصل ہوتی ہے جس کا بیان ہو چکا ہے۔[1] یہ دوسری چیز اس کو انفاق سے حاصل ہوتی ہے چنانچہ یہی رمز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر قرآن میں ساتھ ساتھ ہوا ہے اور سورہ بقرہ کے شروع ہی میں وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ کے ساتھ دوسری چیز جس کا ذکر ہوا ہے وہ انفاق (وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ) ہے۔

یہ دونوں چیزیں درحقیقت وہ دو بنیادیں ہیں جن پر خلق اور خالق کے ساتھ آدمی کے سارے تعلقات کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یوں سمجھنا چاہیے کہ انہی دو چیزوں پر درحقیقت پورے دین و شریعت کی عمارت قائم ہے۔ پچھلے مذاہب میں بھی تمام نیکیوں کی جڑ انہی دو چیزوں کو قرار دیا گیا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے ایک مرتبہ ان کے ایک شاگرد نے پوچھا کہ اے استاذ تمام نیکیوں کی جڑ کیا چیز ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ تو تمام دل و جان سے اپنے خداوند خدا سے محبت کر اور دوسری چیز یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے محبت کر۔ پھر فرمایا کہ انہی دو چیزوں پر تمام دین و شریعت قائم ہیں۔

[1] "تزکیہ نفس" کے سلسلہ مباحث کا یہ مضمون متعدد رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔

پڑوسی سے محبت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس کے لیے اپنا مال خرچ کرے، اس کے دکھ درد میں اس کا شریک بنے اور اس کی مشکلات میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا اولین مظہر نماز ہے اسی طرح اس کی مخلوق کے ساتھ محبت کا اولین مظہر انفاق ہے۔

گو ظاہر میں یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے دوسری چیز درحقیقت پہلی چیز کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ جو آدمی خالق سے محبت کرے گا وہ اس کی مخلوق سے بھی ضرور محبت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنی عیال سے تعبیر فرمایا ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ اگر اس کو کسی سے محبت ہوجائے تو اس کے متعلقین سے بھی محبت ہوجاتی ہے۔ اپنی اس فطرت کے تقاضے سے جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے وہ اس کی مخلوق سے بھی محبت کرنے لگتا ہے اور یہ محبت تدریجاً ہر خلق کی ہمدردی اور ان کے لیے مالی ایثار کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں انسان کو اللہ تعالیٰ سے جو محبت ہوتی ہے وہ اس کے جذبہ شکر گذاری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ جب اپنی ذات اور اپنے گردوپیش پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالتا ہے تو ہر پہلو سے اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ ان نعمتوں کا احساس اس کو ایک طرف تو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ اپنے رب کی بندگی اور پرستش کرے چنانچہ اسی تحریک سے وہ نماز پڑھتا ہے اور پھر یہی جذبہ دوسری طرف اس کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ جس طرح اس کے رب نے اس کے اوپر احسان فرمایا ہے اسی طرح وہ اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کے دوسرے بندوں پر احسان فرمائے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ ان میں سے ایک چیز دوسری سے پیدا بھی ہوتی ہے اور پھر انہی دونوں پر تمام دین و شریعت کی بنیاد بھی ہے۔ ایک تمام حقوق اللہ کا سرچشمہ ہے اور دوسری تمام حقوق العباد کی اصل ہے۔ جو آدمی دوسروں کے لیے اپنا مال خرچ کرسکتا ہے وہ ان کے دوسرے حقوق ادا کرنے میں بھی تنگ دل نہیں ہوگا۔ انسان کا دل اگر مال کی محبت اور بخالت کی بیماری سے پاک ہوجائے تو اس کے لیے وہ تمام نیکیاں آسان ہوجاتی ہیں جن سے ایک آدمی اپنے معاشرے کا بہترین فرد بنتا ہے۔ اور اگر اس کا دل مال کی محبت میں گرفتار ہے تو اس کے لیے نیکی کا ہر کام دشوار بن جاتا ہے۔ قرآن مجید نے یہ حقیقت اس طرح سمجھائی ہے۔ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ وَأَمَّا مَن بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ (پس جس نے دیا اور خدا سے ڈرا اور اچھے انجام کو سچ مانا اس کے لیے ہم راہ کھولیں گے آسانی کی اور جس نے بخیلی کی اور خدا سے بے نیاز رہا اور اچھے انجام کو جھوٹ جانا تو اس کو ڈالیں گے ہم تنگی کی راہ پر)

انفاق سے حکمت حاصل ہوتی ہے

انفاق کی تیسری برکت یہ ہے کہ یہ دین کے دوسرے تمام عقائد و اعمال کے لیے بمنزلہ غذا اور پانی کے ہے۔ اس سے آدمی کی وہ نیکیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں جو کمزور اور نازک ہوتی ہیں اور اس کے وہ عقائد مستحکم اور پائدار

ہوجاتے ہیں جو ابھی اچھی طرح دل میں راسخ نہیں ہوئے ہوتے ہیں۔ دین کے عقائد اور اعمال کا یہی رسوخ و استحکام ہے جس کو قرآن مجید میں حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکمت کے خزانہ کی کلید درحقیقت انفاق ہی ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے آخر میں انفاق کی برکتیں بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ ۖ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ (۲۶۸ - ۲۶۹ بقرہ)

شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے تمہارے لیے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ اور اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر ملا۔

یہ اس انفاق کی برکت بیان ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے دل کو دین کے احکام پر جمانے کے لیے کیا جائے۔ چنانچہ اس کی تمہید یوں شروع ہوتی ہے وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ (ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال خرچ کرتے ہیں اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دل کو جمانے کے لیے) "اپنے دل کو جمانے کے لیے" یعنی دل کی خواہشات کے علی الرغم وہ اپنے مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ ان کے لیے خدا کے احکام کی تعمیل اور اس راہ میں ہر قربانی آسان ہوجائے۔ جو لوگ اس مقصد سے مال خرچ کرتے ہیں ان کا صلہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ ان کو اپنی مغفرت اور اپنے فضل سے نوازتا ہے اور ساتھ ہی ان کو حکمت کا وہ خزانہ بھی عطا فرماتا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

مال میں برکت

انفاق کی چوتھی برکت یہ ہے کہ اس سے آدمی کے مال میں برکت ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس برکت کی مثال اس طرح بیان ہوئی ہے:-

مَّثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے راستہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ ہو جو اگائے سات بالیاں جن کی ہر بال میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھاتا ہے اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ۔ اللہ سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

یہ برکت آخرت میں جو ظاہر ہوگی وہ تو ہوگی ہی، اس دنیا میں بھی اس شخص کے مال میں برکت ہوتی ہے جو خدا کی راہ میں اپنا

مال خرچ کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے بے شمار بندے جو اس کے مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ یہ دعائیں کرنے والے بالعموم اہل حاجت ہوتے ہیں جو اپنی حاجت مندی کے سبب سے اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرمائے۔ بلکہ بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے لیے خدا کے فرشتے بھی برکت کی دعا کرتے ہیں۔ ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندوں پر کوئی صبح بھی نہیں آتی ہے مگر دو فرشتے اترتے ہیں۔ ایک یہ دعا کرتا ہے کہ اے خدا تو اپنی راہ میں مال خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما اور دوسرا یہ دعا کرتا ہے کہ تو بخیل کو بربادی اور نقصان عطا فرما۔" (متفق علیہ)

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ برکت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے کی تجوریاں بھر جاتی ہیں، یا اس کے بنک بیلنس میں اضافہ ہو جاتا ہے یا اس کے املاک و جائداد کی مقدار اور تعداد کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے بلکہ برکت کا مفہوم یہ ہے کہ مال کا جو حقیقی فائدہ اور نفع ہے جس مقدار میں وہ حاصل کرتا ہے اس کے مقابل میں دوسرے حاصل نہیں کر پاتے۔ خلق خدا کی جو خدمت اس کے مال سے انجام پاتی ہے دوسروں کے مال سے انجام نہیں پاتی، معاشرے اور تمدن کی اصلاح و ترقی میں جو حصہ اس کے مال کا ہوتا ہے دوسروں کے مال کا نہیں ہوتا، خدا کی خوشنودی کا جو لازوال خزانہ وہ اپنے مال کے بدلے میں حاصل کر لیتا ہے دوسرے اس سے محروم رہتے ہیں، خلق خدا کے دلوں میں عزت اور محبت کا جو مقام اسے ملتا ہے، روپے کی گڈیاں رکھنے والے اور کوٹھیوں اور کاروں کے مالک اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو فراغ خاطر، جو سکون قلب، جو اعتماد علی اللہ، جو قلبی مسرت اور دل اور روح کی جو بادشاہی اس کو حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو کبھی خواب میں بھی وہ چیز نظر نہیں آتی۔

اس برکت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انفاق کرنے والے کا مال چونکہ دوسروں کے دبائے ہوئے حقوق کی ناجائز ملاوٹ سے پاک ہوتا ہے اس وجہ سے صالح بیج کی طرح اس کی قوت نشو و نما میں بڑا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی قدر و قیمت کو مضاعف کر دیتا ہے اور ان آفتوں سے وہ محفوظ ہو جاتا ہے جو غیبی اندر اندر ان مالوں کو چٹ کرتی رہتی ہیں جن کے اندر دوسروں کے حقوق کی آلائشیں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔

آفات اور ان کا علاج

انفاق کی یہ برکتیں نہایت واضح الفاظ میں قرآن اور حدیث میں بیان بھی ہوئی ہیں اور ہر شخص اپنے ذاتی تجربہ سے بھی ان کی صحت و صداقت کا اندازہ کر سکتا ہے لیکن نماز کی طرح اس کے لیے بھی چند آفتیں ہیں۔ اگر انفاق کرنے والا ان آفتوں سے

ہوشیار نہ رہے اور اپنے انفاق کو پوری احتیاط کے ساتھ ان سے بچانے کی کوشش نہ کرے تو پھر اس کے انفاق کی ساری برکت برباد ہو کے رہ جاتی ہے اور وہ ان فوائد میں سے کوئی ایک فائدہ بھی حاصل نہیں کر پاتا جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ ہم ان آفتوں میں سے چند اہم آفتوں کا بیان ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی قرآن اور حدیث کی روشنی میں ان کے تدارک کی تدبیریں بھی بتائیں گے

صدقہ اتارنے کی خواہش | بہت سے لوگ خدا کی راہ میں خرچ تو کرتے ہیں لیکن دل کی فیاضی، ولولہ اور حوصلہ کے ساتھ نہیں خرچ کرتے بلکہ ان کے پیش نظر صرف ایک مطالبہ کو کسی نہ کسی طرح پورا کر دینا ہوتا ہے۔ جس طرح وہ حکومت کا عائد کردہ کوئی ٹیکس ادا کر دیتے ہیں اسی بددلی اور افسردگی کے ساتھ کسی دینی و مذہبی کام کے لیے بھی کچھ مال وہ نکال دیتے ہیں۔ اس بددلی کے سبب سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرتے وقت ان کی خواہش اور کوشش ہر پہلو سے یہ ہوتی ہے کہ خدا کی راہ میں وہ چیز دیں جس کا دینا ان کے دل پر گراں نہ گزرے، جو ان کی ضرورت سے بالکل فاضل ہو یا جس سے کم از کم ان کو کوئی بڑا فائدہ اٹھا سکنے کی توقع نہ ہو۔ اگر قربانی کریں گے تو ایسے جانور کی جو کم قیمت اور بے حیثیت ہو، صدقہ کریں گے تو ایسے مال کا جو انھیں خود قبول کرنا پڑے تو اس کو دیکھ کر کانوں پر ہاتھ رکھیں گے، اگر کسی قومی اور مذہبی مقصد کے لیے اپنی کوئی چیز الگ کریں گے تو وہ چیز جس کی فائدہ بخشی کی صلاحیت اب ختم ہو رہی ہو۔

اس طرح کا انفاق نہ صرف یہ کہ کوئی خیر و برکت نہیں پیدا کرتا بلکہ وہ سرے سے اللہ تعالیٰ کے ہاں شرف قبولیت ہی نہیں پاتا۔ انفاق کے موجب خیر و برکت ہونے کے لیے سب سے پہلی چیز آدمی کے دل کی آمادگی اور تیاری ہے۔ جو انفاق دل کی آمادگی کے ساتھ نہ کیا جائے وہ خدا کے ہاں قبول ہی نہیں ہوتا تو اس میں خیر و برکت کیا ہوگی؟

یہ آمادگی اور تیاری اس شعور کو بیدار رکھنے سے پیدا ہوتی ہے کہ خدا یا اس کا کوئی کام ہمارا یا ہمارے مال کا محتاج نہیں ہے بلکہ ہم خود ہر لحظہ اس کی عنایت و مہربانی کے محتاج ہیں۔ یہ محض اس کی طرف سے ہمارا ایک امتحان ہے کہ وہ اپنے ایک ہاتھ سے ہمیں بخشتا ہے اور دوسرا ہمارے آگے مانگنے کے لیے بڑھاتا ہے تاکہ دیکھے کہ ہم اسی کا بخشا ہوا مال خود اسی کو دیتے ہوئے کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ فیاضی اور حوصلہ کے ساتھ دیتے ہیں یا تنگ دلی اور ترشروئی کے ساتھ۔ جو لوگ اس آزمائش سے آگاہ ہیں وہ انفاق کے ہر موقع کو خدا کی رضا جوئی کا ایک مغتنم موقع سمجھتے ہیں اور اس کی راہ میں اپنے مال و متاع کا وہ حصہ پیش کرتے ہیں جو انھیں خود محبوب ہوتا ہے۔ کسی محبوب چیز کو پیش کرنا بجائے خود اس بات کی بہت بڑی شہادت ہے کہ وہ دل کی پوری آمادگی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

بعض چیزوں کی محبوبیت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ بجائے خود قیمتی اور پسندیدہ ہوتی ہیں اور بعض چیزیں اگرچہ بجائے خود

بہت قدر و قیمت والی نہیں ہوتیں مگر بعض حالات ان کو قیمتی اور محبوب بنا دیتے ہیں۔ مثلاً قحط اور گرانی کے زمانہ میں معمولی غذائی سامان بھی ہر شخص کے لیے محبوب و مطلوب بن جاتا ہے۔ یا ایک غریب آدمی کے لیے اس کی جیب کا دھیلا بھی بڑی قیمتی چیز ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ساری چیزیں محبوب ہی شمار ہوتی ہیں اور خلوص نیت کے ساتھ ان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے وہی برکتیں حاصل کرتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ ایک مزدور اپنے پسینے کی کمائی کے چند ٹکے خدا کی راہ میں خرچ کر کے وہی اجر و ثواب حاصل کر سکتا ہے جو ایک امیر کبیر اپنی اشرفیاں نثار کر کے حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ ایک غریب کے لیے اس کے چند ٹکے اسی طرح محبوب ہیں جس طرح ایک دولت مند کو اس کی اشرفیاں محبوب ہو سکتی ہیں۔

محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو خرچ کرنے ہی سے اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا حق ادا ہوتا ہے، جو لوگ محض زبانی جمع خرچ سے اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں ان کے بارے میں قرآن مجید کا یہ ارشاد ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ (۹۲ - آل عمران)

تم خدا کی وفاداری کا درجہ اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو۔

جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا ناپسندیدہ یا غلط راہوں سے آیا ہوا مال دے کر خدا کو منانے کی خواہش رکھتے ہیں ان کے بارے میں قرآن کا یہ ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ (۲۶۷ بقرہ)

اے ایمان لانے والو، خرچ کرو ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں اور اس میں سے بری چیز کے خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو جس کو تم خدا کی راہ میں تو خرچ کرو اور تم اس کے خود لینے والے نہ ہو مگر آنکھیں میچ کر، اور یاد رکھو کہ اللہ بے پروا اور حمید ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں طیبات سے وہ چیزیں مراد ہیں جو بجائے خود بھی اچھی اور پسندیدہ ہوں اور جو حاصل بھی جائز اور پسندیدہ طریقہ سے ہوئی ہوں۔

اس حقیقت کی عملی مثال کے طور پر ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی سے ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سارے مدینہ میں کھجور کے باغوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ مالدار تھے۔ ان کا سب سے اچھا باغ جو ان کو سب سے زیادہ محبوب تھا، بیرحاء تھا۔ یہ بالکل مسجد نبوی کے سامنے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لے جایا کرتے تھے اور اس کے میٹھے چشمے کا پانی پیا کرتے تھے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب آیت "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" اتری تو ابو طلحہ رضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ، آپ پر یہ آیت اتری ہے اور مجھے اپنے مالوں میں سب سے زیادہ محبوب میرا باغ بیرحاء ہے تو میں اب اس کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اللہ کے ہاں اس کا اجر و صلہ چاہتا ہوں۔ یا رسول اللہ، اب آپ اس کو جس مصرف میں چاہیں لے آئیں۔ حضور نے فرمایا، یہ تو بڑی چیز ہے! بڑا نفع بخش باغ ہے! میں نے تمہاری بات سن لی، میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو اپنے قرابت داروں میں تقسیم کر دو۔ ابو طلحہؓ نے کہا، ایسا ہی کروں گا یا رسول اللہ۔ چنانچہ ابو طلحہؓ نے اس کو اپنے عزیزوں اور چچا زاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ (متفق علیہ)

احسان جتانا اور بدلہ چاہنا

انفاق کے لیے دوسرا بڑا عام فتنہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ خرچ کرنے کو تو کرتے ہیں لیکن یہ خرچ کرنا اپنے ذاتی اغراض سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ جس کو دیتے ہیں یا تو اس کے کسی احسان کا بدلہ چکاتے ہیں یا اس کو اپنے زیر احسان لانا چاہتے ہیں یا کم سے کم ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس دینے سے وہ شکر گزار اور ممنون ہوگا اور اس شکر گزاری اور ممنونیت کا اثر اس کی طرف سے کسی نہ کسی فائدہ کی شکل میں ضرور ظاہر ہوگا۔ اس قسم کا انفاق درحقیقت ایک کاروبار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خرچ کرنا خدا کی راہ میں خرچ کرنا نہیں ہے بلکہ ایک کاروبار میں نفع کی امید پر سرمایہ لگانا ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں ان کو کسی نفع کی توقع نہ ہو وہاں اول تو وہ اپنا مال لگانے سے بچتے ہیں لیکن اگر غلطی سے کہیں لگا بیٹھتے ہیں تو اپنا پورا فائدہ وصول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر وصول نہیں ہو پاتا تو انتقام پر اتر آتے ہیں اور اس کے لیے ذلیل اور چھچھورے طریقے اختیار کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ مثلاً یہ کہ جس کو انھوں نے کبھی کچھ دیا ہے اس پر احسان جتائیں گے۔ اس کو ناشکرا اور احسان فراموش قرار دیں گے، دوسروں کی موجودگی میں اس کے اوپر اپنے احسانات گنائیں گے، وقت بے وقت مختلف قسم کے طعنوں اور کچوکوں سے صرف اسی کے نہیں بلکہ اس کے بیوی بچوں کے دل بھی زخمی کریں گے۔ ان کا مطالبہ یہ ہوگا کہ جب ایک مرتبہ انھوں نے اس کے اوپر کوئی چھوٹا یا بڑا احسان کر دیا ہے تو پھر مدت العمر کے لیے وہ اور اس کا پورا خاندان ان کا خانہ زاد غلام بن کے کیوں نہ رہے۔

جو لوگ اپنے انفاق کے پیچھے یہ بلا لگا لیتے ہیں وہ اپنے انفاق سے کوئی برکت حاصل کرنا تو الگ رہا، اس سے الٹا نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہ حرکتیں ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہمدردی اور خیر خواہی کا ایک کلمہ سیم و زر کے اس ڈھیر سے کہیں زیادہ قیمتی ہے جس کو دے کر احسان جتایا گیا ہو۔ قرآن مجید

میں فرمایا گیا ہے :

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَآ اَذًى ط وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ○ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ط لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ط وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ (۲۶۲ - ۲۶۴)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اپنے اس انفاق کے پیچھے احسان اور ایذا کی آفت نہیں لگا دیتے ان کے لیے ان کا صلہ ہے ان کے رب کے پاس ۔ نہ ان کے لیے کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۔ بھلی بات کہہ دینا اور بخش دینا بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے دل آزاری ہو ۔ اور اللہ بے نیاز اور حلیم ہے ۔ اے ایمان والو تم اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے باطل نہ کرو ۔ اس شخص کے مانند جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا ۔ اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو ، اس پر بارش ہو جائے اور اس کو بالکل چٹان کو چٹیل چھوڑ دے ۔ ایسے لوگوں کو ان کی کمائی سے کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا اور اللہ کافروں کو راہ یاب نہیں کرتا ۔

احسان جتانے اور دل آزاری کر دینے سے صدقات جس طرح باطل ہو جاتے ہیں اس کی دوسری تمثیل قرآن حکیم نے اس طرح بیان فرمائی ہے :

اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ (۲۶۶ بقرہ)

کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں جاری ہوں ، اس میں اس کے لیے ہر قسم کے پھل ہوں اور خود اس کا حال یہ ہو کہ اس پر بڑھاپا آچکا ہو اور وہ ناتواں بچے رکھتا ہو اور اس کے باغ پر سموم کا جھونکا آجائے جس سے وہ جل اٹھے ۔

اس آفت سے اپنے انفاق کو بچانے کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی انفاق کرتے وقت اپنے آپ کو ہر قسم کی کاروباری ذہنیت سے پاک کر کے انفاق کرے اور یہ خیال دل سے بالکل نکال دے کہ وہ اگر کسی کو کچھ دے رہا ہے تو اس پر کوئی احسان کر رہا ہے ۔

اور مال کے بجائے وہ اس امر واقعی کو ذہن نشین کرے کہ یہ اللہ کا اس کے اوپر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اس کو نہ صرف دینے کے قابل بنایا بلکہ دینے کی توفیق بھی بخشی ۔ دیتے وقت آدمی کا ذہن جو ہونا چاہیے اس کی بہترین تعبیر قرآن کے ان الفاظ سے ہوتی ہے ۔ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (دہر) ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں ، ہم تم سے کسی عوض اور شکر گزاری کے طالب نہیں ہیں ۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے مال اپنے انفاق کا وہ صلہ چاہتا ہے جو اس کو بہشت کا باغ کر دے اس کو قرآن مجید کی یہ آیات ہمیشہ اس طرح یاد رکھنی چاہئیں ۔

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ○ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ○ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ○ وَلَسَوْفَ یَرْضٰى ○ (سورہ لیل)

جو دیتا ہے اپنا مال تزکیہ حاصل کرنے کے لیے ۔ اس پر کسی کا احسان نہیں کہ اس کو اس کا بدلہ چکانا ہو ۔ اس کے پیش نظر صرف اپنے پروردگار عالیشان کی رضا جوئی ہے اور وہ جلد نہال ہو جائے گا ۔

سائلوں کے ساتھ بدسلوکی | انفاق کو برباد کرنے والی ایک بہت بڑی آفت وہ سلوک بھی ہے جو عام طور پر لوگ سائلوں کے ساتھ کرتے ہیں ۔ بہت سے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ مانگنے والوں کو کچھ دے تو دیتے ہیں لیکن اتنی جھڑکیاں اور اتنی صلواتیں ان کو سناتے ہیں کہ وہ جتنی نیکی کماتے ہیں اس سے کہیں زیادہ گناہ اپنے سر چڑھا لیتے ہیں ۔ ان جھڑکیوں اور صلواتوں کے پس پردہ عام طور پر جو چیز ہوتی ہے وہ عموماً ان کی طبیعت کی خست اور دنائت ہی ہوتی ہے لیکن بعض لوگ اپنی اس حرکت کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے معاشرے کو گداگری کی ذلت سے پاک کرنا چاہتے ہیں ۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے ۔ اول تو گداگری کی لعنت سے معاشرے کو پاک کرنے کے لیے یہ طریقہ ہی بے معنی ہے اور اگر بالفرض یہ کسی درجہ میں مفید بھی ہے تو اس کے لیے جھڑکیاں اور صلواتیں ہرگز ضروری نہیں ہیں ۔ یہ کام شائستہ انداز اور حکیمانہ طرز پر محبت اور شفقت کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے ۔ اس آفت سے بچنے کے لیے آدمی کو قرآن مجید کی یہ ہدایت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ سائل کو نہ جھڑکو ۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض سائل ایسے ہوتے ہیں جو اس طرح پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ ان سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے ۔ بہت سے ایسے بھی ملتے ہیں جن کے گداگری کا پیشہ اختیار کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ بعض ایسے بھی ملتے ہیں جن کو دیکھ کر آدمی صاف سمجھ جاتا ہے کہ یہ بھکاری بن گئے ہیں ۔ اس طرح کے لوگوں کو دیکھ کر آدمی کو قدرتی طور پر غصہ آتا ہے ۔ لیکن ان پر غصہ کرنے اور ان کو جھڑکنے اور دھتکارنے سے کوئی فائدہ نہیں ۔ اس سے ان کی اصلاح تو ہونے سے رہی البتہ آدمی اپنے اخلاق کو بگاڑنے کا خواہ مخواہ ایک سبب پیدا کر لیتا ہے ۔ اگر آدمی کچھ دے سکے تو دیدے اور اگر نہ دے سکے یا ان کو غیر مستحق

کچھ تو ہمدردی یا نصیحت کے چند کلمات کے ساتھ ان کو رخصت کرنے کی کوشش کرے۔

سائلوں کے بارے میں قرآن مجید نے بار بار ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے اور ان کو نرم جواب دینے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ بعض حالات میں چونکہ ان کا رویہ غصہ دلانے والا ہو سکتا ہے اس وجہ سے بار بار تاکید کی گئی کہ ان کو نرمی سے جواب دو۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۳۴ آل عمران)	جو خوشحالی اور تنگ حالی دونوں حالتوں میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى، وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ (۲۶۳ بقرہ)	دستور کے مطابق بات کہنا اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو
اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا (۲۸ بنی اسرائیل)	اگر تم ان سے اعراض کرنے پر مجبور ہو تو، اپنے رب کا فضل چاہتے ہوئے، تو ان سے کہو کوئی نرم بات۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اگر ہم اور آپ سائلوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کریں گے تو سارا معاشرہ گداگری کا پیشہ اختیار کرے گا۔ لوگ گداگری کی ذلت اس وجہ سے نہیں اختیار کرتے کہ دینے والے بڑے خوش اخلاق اور فیاض ہیں۔ اس کے اسباب بڑے گہرے اور عمیق ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اگر دینے والوں کی شرافت اور فیاضی گداگری کو فروغ دینے والی چیز ہوتی تو آخر تاریخ کے بہترین دور میں مدینہ منورہ میں یہ صورت حال کس طرح پیدا ہو جاتی کہ لوگ اپنی زکوٰۃ کا مال گلیوں میں لیے پھرتے لیکن ان کو کوئی سائل نہ ملتا۔

گداگری کو روکنا افراد کا کام نہیں بلکہ حکومتوں کا کام ہے۔ یہ چیز بڑی اہم معاشرتی و معاشی تبدیلیوں سے روکی جا سکتی ہے۔ افراد کا کام یہ ہے کہ جب تک یہ صحیح تبدیلی واقع نہیں ہو جاتی وہ سائلوں کے معاملہ میں وہی روش اختیار کریں جس کی قرآن ہدایت کرتا ہے۔

انتقام و عناد کا جذبہ بعض حالات میں انتقام و عناد کا جذبہ بھی آدمی کے انفاق کے لیے مانع بن جایا کرتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی کسی مقدم حقدار کے لیے انفاق کرنے سے اس لیے گریز کرتا ہے کہ کسی سبب سے اس کو اس شخص سے نفرت یا عداوت ہو جاتی ہے۔ فرض کیجیے آپ کا کوئی عزیز یا آپ کا کوئی پڑوسی ہے جو مستحق مدد ہے

اسلام نے انفاق کے لیے جو ترتیب قائم کی ہے اس کی رو سے آپ کے انفاق کا اولین حقدار آپ کا وہی عزیز یا آپ کا وہی پڑوسی ہے لیکن آپ اس عزیز یا پڑوسی سے کوئی شکایات رکھتے ہیں اس وجہ سے اس کو چھوڑ کر دوسروں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ عزیزوں اور پڑوسیوں کے معاملہ میں ایسا بہت ہوتا ہے۔ میں نے بہت سے خوشحال اور دولتمند لوگوں کے بھائیوں اور عزیزوں کو دیکھا ہے کہ وہ نہایت غربت اور پریشانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن ان کے خوش حال عزیز انفاق کے اہل اور عادی ہونے کے باوجود ان کی کوئی مدد نہیں کرتے، ان کو نظر انداز کر کے دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ ان کو اپنے ان عزیزوں سے کچھ واقعی یا غیر واقعی شکایات ہوتی ہیں۔

یہ طرز عمل اس ترتیب کو بالکل بدل دیتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے انفاق کے لیے بتائی ہے۔ یہ حقیقت ملحوظ رہنی چاہیے کہ یہ ترتیب کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر معاشرت و معیشت کی نہایت گہری حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں جو اس کو بدل دینے کی شکل میں فوت ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگر ہم اپنے انفاق کا مستحق انہی کو سمجھتے ہیں جن سے ہم راضی اور خوش ہیں اور جن کو اپنے منشاء کے مطابق پا رہے ہیں تو یہ انفاق بے غرض انفاق تو نہ ہوا۔ یہ تو وہی خود غرضانہ اور کاروباری انفاق ہوا جس کو اللہ اور رسول نے باطل اور بے برکت قرار دیا ہے۔ جو شخص اپنے انفاق کی برکت سے محروم نہیں ہونا چاہتا اس کو چاہیے کہ وہ اس ترتیب کو ٹوٹنے نہ دے جو اللہ اور رسول نے انفاق کے حق داروں کی بتا دی ہے۔ اگر اس ترتیب کے رو سے سر فہرست کوئی ایسا شخص آتا ہے جس سے اس کو کسی سبب سے نفرت ہے تو بھی اس کو ضرور دے اور اس کی غلطیوں سے درگذر کرے۔ اوپر آل عمران والی آیت میں انفاق کرنے والوں کی یہ صفت جو بیان کی گئی ہے کہ وہ غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کی غلطیوں سے درگذر کرنے والے ہیں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ غصہ کو پی جانے والے اور عفو و درگذر کی طبیعت رکھنے والے ہیں یہی لوگ انفاق کا صحیح حق ادا کر سکتے ہیں۔

ایک حدیث میں بھی اس انفاق کا بڑا درجہ بیان کیا گیا ہے جو کسی ایسے عزیز کے لیے کیا جائے جس کے متعلق انفاق کرنے والے کو یہ گمان ہو کہ وہ اپنے دل میں اس کی عداوت چھپائے ہوئے ہے۔

اس انفاق کا درجہ بڑا ہونے کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں:-

— ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح انفاق کرنے والا شخص اپنے خواہشات و جذبات سے بالاتر ہو کر محض اللہ کی رضا کے لیے ایک ایسے شخص کو اپنا مال دیتا ہے جس کو وہ اپنے مقصد اور اپنی اغراض کے خلاف پاتا ہے۔

— دوسری وجہ یہ ہے کہ اس انفاق میں انفاق کرنے والے کو دوگونہ مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ایک انفاق کی

دوسری ایک ایسے شخص کے لیے انفاق کی جس سے اس کو نفرت ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں انفاق کرنے والا صلہ رحم کا ایک ایسا حق ادا کرتا ہے جس سے مردہ محبت و اخوت کے از سرِ نو زندہ ہونے کی توقع ہے اور جس کا زندہ ہونا اللہ اور اس کے رسول کو بہت پسند ہے۔

ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی آدمی اچھی طرح سمجھ جائے تو وہ اپنے ان قرابت داروں کے اوپر خرچ کرنے میں سب سے زیادہ ٹھنڈک اور راحت محسوس کرے گا جن کو وہ اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ اور تجربہ اس کو بتا دے گا کہ اس انفاق سے زیادہ بابرکت انفاق کوئی اور نہیں ہے۔

احساسِ برتری انفاق کے سلسلہ کی ایک بڑی عام آفت احساسِ برتری بھی ہے۔ جو شخص اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم یا اپنے مذہب کے لیے کچھ خرچ کر سکے جب وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کے ہاتھ اس کے آگے پھیل رہے ہیں اور بہت سے ضرورت مند لوگ اس کی طرف رجوع کر رہے ہیں تو اس کے دماغ میں بڑائی اور برتری کی ہوا سما جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دینے والے کی پوزیشن میں پا کر لینے والوں کے مقابل میں بہت ارفع اور بہت اونچا خیال کرنے لگتا ہے۔ بعض تنگ ظرف اپنے اس احساس کو دبا نہیں سکتے، چنانچہ اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ان کی زبانوں سے بھی ہونے لگتا ہے اور ان کے انداز و اطوار بھی اس کی شہادت دینے لگتے ہیں۔

یہ احساس اس جذبۂ شکر کی جڑ کاٹ دیتا ہے جس کو انفاق فی سبیل اللہ کا اصل محرک ہونا چاہیے۔ اس سے آدمی مغرور، متکبر اور خود پسند بن جاتا ہے۔ تواضع جو عبدیت کی روح اور انکسار جو بندگی کی جان ہے اس کے اندر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگوں کی احتیاج اور تنگ دستی سے اپنے لیے کوئی مفید سبق حاصل کرنے کے بجائے اس کو بہتوں پر اپنی آقائی اور خدائی جمانے کا ذریعہ بنا لیتا ہے اور رفتہ رفتہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ اس کے پاس بھی جو کچھ ہے کسی اور کا بخشا ہوا ہے، اور اس کی یہ بخشش کسی استحقاق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ محض اس کا فضل و کرم ہے۔

آدمی اگر اس فتنہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہے تو اس کے لیے سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ جس سائل اور محتاج کو بھی دیکھے اس سے یہ سبق سیکھنے کی کوشش کرے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کو بھی اسی سائل کی حیثیت میں پیدا کر سکتا تھا اور اگر چاہے تو اب بھی اسی کی صف میں اس کو کھڑا کر سکتا ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ وہ جب کسی کو کوئی چیز دے تو اس کی ہیئت اس بات کی گواہی دے رہی ہو کہ اس کا دل خدا کے آگے جھکا ہوا ہے اور اس کو اس بات پر کوئی فخر نہیں ہے کہ وہ دے رہا ہے بلکہ اس بات پر اپنے رب کا شکر گزار ہے کہ اس نے اس کو دینے کے لائق بنایا اور پھر دینے کی توفیق بخشی۔ قرآن مجید کی اس آیت میں شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُونَ (۵۵ مائدہ) جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور حال یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس آیت کو تلاوت کرتے وقت مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ یہاں وَهُمْ رٰكِعُونَ درحقیقت ادائے زکوٰۃ کی ہیئت و حالت کو ظاہر کر رہا ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ زکوٰۃ دینے والے متکبر دولتمندوں کی طرح اپنی زکوٰۃ کو اپنی شانِ دولتمندی کی نمائش کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ عبدیت اور بندگی کی جو شان ان کے اندر نماز پیدا کرتی ہے وہی شان ان کی زکوٰۃ میں بھی ہوتی ہے۔ وہ کسی کو اپنی زکوٰۃ دیتے ہیں تو مغروروں کی طرح تن کر نہیں دیتے بلکہ خدا کے شکر گزار اور خاکسار بندوں کی طرح سر جھکا کر دیتے ہیں۔

ریا اور نمائش ریا اور نمائش بھی ایک بہت عام فتنہ ہے جس میں انفاق کرنے والے لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ یوں تو ریا نیکی کے ہر کام کو برباد کرنے کے لیے اس میں آگھستی ہے لیکن بعض کاموں میں اس کے گھس آنے کے بہت سے مواقع ہیں۔ ان میں انفاق کا کام بھی اپنے اندر ریا اور نمائش کے در آنے کے لیے بڑی گنجائش رکھتا ہے۔ اول تو آدمی کو اپنی دولتمندی کے اشتہار کی یوں ہی بڑی خواہش ہوتی ہے پھر اگر یہ اشتہار اس کو دین کے واسطے سے حاصل ہو تو کیا کہنا ہے۔ چنانچہ بہت سے شہرت کے مریض اس میدان میں آ کودتے ہیں اور وہ مختلف قومی اور مذہبی کاموں میں محض اس خیال سے چندے دیتے ہیں کہ لگے ہاتھوں ان کی مالداری اور ان کی دینداری دونوں کی دھوم مچ جائے۔ بعض اوقات اس میں بعض دوسرے اغراض و مقاصد بھی شامل ہو جاتے ہیں مثلاً حکامِ وقت کی خوشنودی اور پھر ان سے استفادہ یا کسی انجمن کی صدارت و ریاست یا کسی عہدہ کو خوش کر کے اس کا ووٹ حاصل کرنا۔ اس طرح سے یہ ایک کاروبار بھی بن جاتا ہے۔ بعض لوگ اس نمود و نمائش کے اتنے رسیا ہوتے ہیں کہ وہ اس کام میں کبھی ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کے روادار نہیں ہوتے جہاں سرِ فہرست اخبار میں ان کا نام آنے کی توقع نہ ہو اگرچہ وہ کام فی الواقع کتنا ہی مفید ہو۔ بعض دینے سے پہلے اس بات کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کے دینے کی شہرت ہو جائے۔ بعض ان سے بھی چار قدم آگے ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ دیں دلائیں تو [illegible] ان کے دینے کی چار دانگ عالم میں دھوم مچ جائے۔

[illegible] زمانہ میں اس اخباری انفاق کے لیے ایک وجہ جواز بھی تلاش کر لی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اس سے دوسروں کو انفاق [illegible] ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے یہ فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے کہ اس سے دوسروں کو بھی اس مقصد کے لیے [illegible] کی تحریک ہوتی ہے لیکن اس زمانہ میں اس انفاق بالجہر کا طریقہ ہی ایسا طریقہ رہ گیا ہے جس پر لوگوں کو اعتماد رہ گیا ہے۔ [illegible] خرچ کرنے والی بات اب ہر جگہ سے غائب ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ دینی حلقوں میں بھی اب اس کا (باقی صفحہ ۵۵ پر)

اسلامی قانون کی بنیادیں

امین احسن اصلاحی

اسلامی قانون میں حرکت و ارتقاء

اسلامی قانون کے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں کسی حرکت یا تغیر کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس غلط فہمی میں صرف غیر مسلم ہی گرفتار نہیں ہیں بلکہ وہ مسلمان بھی گرفتار ہیں جو اس کے مزاج اور اس کی خصوصیات سے ناواقف ہیں۔ اس کی خاص وجہ وہ تصور ہے جو عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں اسلامی قانون اور انسانی قانون کے متعلق پایا جاتا ہے۔ انسانی قانون کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین میں اصل دخل سوسائٹی کی ضروریات اور اس کے تقاضوں کو رہا ہے۔ اس وجہ سے سوسائٹی کے حالات میں جس رفتار سے تغیر ہوتا گیا ہے اسی رفتار سے اس میں بھی تغیر ہوتا گیا ہے۔ اسی طرح آیندہ بھی سوسائٹی میں جس رفتار سے تغیر ہوتا جائے گا، یہ قانون بھی بدلتا جائے گا۔ اس کے برعکس اسلامی قانون سوسائٹی کی تبدیلیوں اور اس کے تغیرات کا تابع نہیں مانا جاتا ہے بلکہ اس کی بنیاد خدا کی وحی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت اور عقل و فطرت کے اُن حقائق پر ہے۔ اس کے بنانے میں انسانی خواہشات اور وقتی حالات کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے، اس کے رسولؐ نے اس کی تشریح و توضیح کی ہے اور خدا اور رسول کے سوا کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس میں سرِ مو کوئی تبدیلی کر سکے۔

جہاں تک اس تصور کا تعلق ہے یہ بجائے خود صحیح ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی قانون سوسائٹی کے تغیرات کے تابع نہیں ہے بلکہ سوسائٹی خود اسلامی قانون کے تابع ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ اسلامی قانون ایک بالکل جامد شے ہے، اس میں کوئی لچک نہیں ہے اور یہ سوسائٹی کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتا۔

چونکہ اس مسئلہ میں ہمارے ہاں بہت کچھ افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ ایک طبقہ فی الواقع اسلامی قانون کو ایک بالکل

بے لچک چیز سمجھتا ہے، اور ایک دوسرا طبقہ اس کو ترقی پذیر ثابت کرنے کے شوق میں اس کو انسانی قانون سے بھی کچھ زیادہ بے ثبات و متلوّن بنائے دے رہا ہے اس وجہ سے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اسلامی قانون میں جو پہلو ثبات و استحکام کے ہیں وہ بھی نمایاں کیے جائیں اور اس میں جس حد تک تغیر و تبدیل اور حالات کے ساتھ سازگاری کی صلاحیتیں ہیں وہ بھی نمایاں کی جائیں تاکہ اس کا اصل مزاج سامنے آ سکے۔

اسلامی قانون کی تاریخ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت سب سے پہلی بات یہ پیشِ نظر رکھنی ہے کہ اسلامی قانون کا آغاز جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر میں جو امتیاز حاصل ہے وہ یہ نہیں ہے کہ اس قانون کا آغاز آپ سے ہوا ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کی تکمیل آپ پر ہوئی ہے۔ آپ سے پہلے حضرت آدم سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک جتنے انبیاء علیہم السلام آئے سب اسی قانون کے داعی اور مبلغ تھے۔ انسانی معاشرہ جس رفتار سے ترقی کرتا گیا ہے اور اس کی ضرورتیں جس تدریج و ترتیب کے ساتھ وسیع ہوتی گئی ہیں اسی رفتار سے اس قانون میں بھی وسعت ہوتی گئی ہے۔ اس توسیع و ترقی کے تقاضوں کے تحت اس کے ظاہری ڈھانچے میں بعض ترمیمیں بھی ہوئی ہیں۔ اس ترمیم کے لیے اسلامی اصطلاح نسخ کی ہے۔ جہاں تک بنیادی اصولوں اور اساسی اقدار کا تعلق ہے وہ تو ہمیشہ ایک ہی رہے ہیں لیکن سوسائٹی کی وسعت اگر اس کے ظاہری احکام و قوانین میں کسی ترمیم کی متقاضی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے خود ہی ان احکام و قوانین میں ترمیم بھی فرما دی ہے۔ اس ترمیم کی مختلف صورتیں ہوئی ہیں۔ بعض حالات میں ایک قانون اس سے زیادہ جامع اور وسیع قانون سے بدل دیا گیا ہے اور بعض حالات میں کوئی قانون سوسائٹی کی وسعت و ترقی کے سبب سے غیر ضروری ہو جانے کی وجہ سے نظر انداز بھی کر دیا گیا ہے۔ اس ترمیم و اصلاح اور تراش و خراش کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد اسلامی قانون (یا بالفاظ دیگر اسلامی شریعت) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بالکل جامع اور مکمل شکل میں ملا۔ اس میں وہ پچھلے قوانین بھی شامل ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے باقی رکھنا چاہا اور وہ قوانین بھی ہیں جو خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے اور جو صرف ایک دینِ کامل ہی کے لیے موزوں ہو سکتے تھے۔

یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو قانون دیا گیا وہ بھی تورات کے احکامِ عشرہ کی طرح ایک ہی مرتبہ میں نازل نہیں کر دیا گیا۔ بلکہ یہ بھی ۲۳ سال کی وسیع مدت میں ایک خاص ترتیب و تدریج کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ بعض معاملات میں ابتداءً نرم احکام دیئے گئے پھر اسلامی معاشرہ کے مستحکم ہو جانے کے بعد وہ سخت کر دیئے گئے۔ مثلاً شراب کی حرمت کا حکم، یا بدکاری کی روک تھام کا قانون۔ بعض امور کو اوّل اوّل رواج پر چھوڑا گیا لیکن بعد

میں اُن کے بارہ میں متعین احکام آگئے۔ مثلاً والدین اور دوسرے وارثوں کے لیے وصیت کی ابتدائی اجازت اسی طرح وہ احکام جن کا تحمل صرف ایک مکمل اسلامی معاشرہ ہی کرسکتا تھا اس وقت تک سرے سے نازل ہی نہیں ہوئے جب تک ایک مکمل اسلامی معاشرہ ایک اسلامی ریاست کے ساتھ وجود میں نہیں آگیا۔ یہ تدریج و ترتیب اس قانون میں بھی بعض ترمیمات کی متقاضی ہوئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ چنانچہ اسی ضرورت کے تحت قرآن اور حدیث میں بھی بعض چیزیں منسوخ ہوئیں۔ ان ترمیمات کے بعد یہ قانون نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے اس شکل میں مرتب ہوگیا جس شکل میں اس کو اب رہتی دنیا تک باقی رہنا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب اس موقع پر ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب اسلامی قانون حضرت آدم کے عہد سے لے کر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک برابر ترقی کرتا رہا ہے اور اس کی یہ ترقی برابر انسانی معاشرہ کی حرکت اور ترقی کے متوازی رہی ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچ کر اس کی یہ ترقی رک کیوں گئی؟ معاشرہ کی فطرت کا تقاضا تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ برابر ترقی کرتا رہے۔ پھر اسلامی قانون نے ایک خاص حد سے آگے اپنی حرکت روک کیوں دی؟

اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس قانون کی تکمیل ہوئی ہے، اس کی حرکت معطل نہیں ہوئی۔ تکمیل کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اب یہ اپنی جگہ پر ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا، آگے نہیں بڑھے گا، بلکہ صرف یہ ہے کہ اب یہ اپنے مبادی اور اپنے اصولوں میں کسی اضافہ کا محتاج نہیں رہا۔ اب یہ ان تمام صلاحیتوں سے بھرپور ہے جو ایک دین کامل میں ہونی چاہئیں اور اپنی ان صلاحیتوں کی بدولت یہ اس قابل ہے کہ زندگی کے تمام تغیر پذیر حالات میں یہ ہماری رہنمائی کرسکے۔

اس اجمالی حقیقت کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسلامی قانون کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ بغیر اس کے مزاج کو سمجھے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کی تکمیل ہو جانے کے باوجود یہ تمام تغیر پذیر حالات کے اندر کس طرح ہماری رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے؟

اسلامی قانون کے فلسفہ پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کا مزاج بیک وقت اپنے اندر دو متضاد خصوصیات جمع کیے ہوئے ہے۔ ایک پہلو سے تو یہ ایک ثابت اور غیر تغیر پذیر قانون ہے، انسانی معاشرہ کی کوئی تبدیلی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی لیکن دوسرے پہلو سے نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کی تنظیم کے لیے یہ اپنے اندر کافی لچک اور کافی وسعت بھی رکھتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ لچک مجرد منفعلانہ قسم کی نہیں ہے کہ

زندگی کا ہر تغیر خود اسلامی قانون کو متغیر کردے بلکہ اس کے اندر فاعلانہ رجحان بھی پایا جاتا ہے جس کے سبب سے یہ ہر جگہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق بنانے کے بجائے یہ کوشش بھی کرتا ہے کہ جہاں کہیں ضرورت پیش آئے حالات کو اپنے مطابق بنالے۔

اسلام کی اس وسعت اور اس لچک کا اندازہ کرنے کے لیے مختصر طور پر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اسلامی قانون ہماری زندگی کے معاملات میں دخل کس نوعیت سے دیتا ہے۔ اس کی یہ مداخلت صرف اصول اور کلیات کی ہے یا ساری تفصیلات و جزئیات بھی طے کرکے وہ ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔

جس شخص کی نظر قرآن و حدیث پر ہوگی وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ قرآن و حدیث، جو اسلامی قانون کے اصل ماخذ ہیں، وہ زندگی کی ساری تفصیلات سے نہیں بحث کرتے بلکہ وہ صرف ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے چاروں گوشوں کو متعین کر دیتے ہیں۔ ان کو متعین کردینے کے بعد ہمیں اس بات کے لیے آزاد چھوڑ دیتے ہیں کہ ان چاروں گوشوں کے اندر اسلامی قانون کے مزاج اور اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم زندگی گذاریں۔ یہ آزادی اگرچہ ایک بے قید آزادی نہیں ہے لیکن آگے چل کر ہم یہ بتائیں گے کہ یہ آزادی اسلامی قانون کے لیے حرکت اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ سازگاری کا ایک وسیع میدان کھول دیتی ہے۔

زندگی کے معاملات میں اسلامی قانون کی مداخلت کی نوعیت اس بات کو چند مثالوں سے سمجھیے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ اسلامی قانون کس پہلو سے زندگی کی حد بندی کرتا ہے اور کس نوعیت سے وہ زندگی کے تقاضوں کو سمجھنے اور ان کو اسلامی قانون سے ہم آہنگ کرنے کا کام ہماری اپنی فہم و فراست اور ہماری اپنی صواب دید پر چھوڑتا ہے۔ تاکہ حالات کے تغیر کے ساتھ ساتھ ہم ان میں مناسب اور معقول تبدیلیاں پیدا کرسکیں۔ ہم مثال کے لیے صرف انہی چیزوں کو منتخب کریں گے جن کا ہماری زندگی سے نہایت قریبی تعلق ہے۔

ہماری زندگی سے ایک بڑا قریبی تعلق رکھنے والا مسئلہ کھانے پینے کا مسئلہ ہے۔ اس میں اسلام نے دخل تو دیا ہے لیکن اس دخل کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ پہلے ساری کھانے پینے کی چیزوں کی تفصیل سنائی ہو، پھر یہ بتایا ہو کہ ان میں سے کیا کیا چیزیں جائز ہیں اور کیا کیا چیزیں ناجائز۔ پھر ان کے پیدا کرنے، ان کے سنبھالنے، ان کے تیار کرنے اور ان کے استعمال کرنے کے سارے قاعدے ضابطے بتائے ہوں۔ اسلام کو ان ساری تفصیلات سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اس نے صرف یہ کیا ہے کہ چند متعین چیزوں کو جو حرام ہیں بتا دیا کہ یہ حرام ہیں ان کو کھانا پینا ناجائز ہے۔ اب جو چیزیں اس حکم میں آتی ہیں ان کے بارہ میں شریعت کا رجحان معلوم کرنا اسلام نے ہمارے اجتہاد پر چھوڑا ہے۔ اس کے علاوہ

اس سلسلہ کی ساری چیزوں کو انسان کی طلب، اس کے ذوق، اور اس کی قوت اکتساب و ایجاد پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی طبعی ضرورتوں اور اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرے اور ان کے لیے جو مناسب سمجھے ضابطے اور قوانین بنائے۔

اسی طرح کا مسئلہ ہمارے لباس کا مسئلہ ہے۔ اس بارے میں اسلام نے صرف یہ کیا ہے کہ چند اخلاقی نوعیت کی حدیں مقرر کر دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ لباس ساتر ہو، مرد مسرفانہ لباس مثلاً ریشم کا استعمال نہ کریں۔ لباس سے شہدپن اور غنڈہ پن کا اظہار نہ ہو۔ عورتیں مردوں کا سا اور مرد عورتوں کا سا لباس نہ پہنیں۔ بس اس طرح کی چند شرطیں عاید کر کے ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ ہم جس طرح کے کپڑے چاہیں ایجاد کریں جس طرح کے چاہیں سلوائیں اور جس ڈھب سے چاہیں انہیں پہنیں۔ ان ساری باتوں کا انحصار ہمارے ملک کی آب و ہوا، ہماری قومی روایات، ہمارے فطری ذوق آرائش اور ہماری قابلیت اختراع و ایجاد پر ہے۔ اسلام ان چیزوں کے بارے میں اپنی طرف سے کوئی ضابطہ بندی نہیں کرتا۔

اسی طرح ہماری ازدواجی زندگی کا معاملہ ہے۔ اس میں بھی اسلام نے چند اصول دے دیئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کی بنیاد جائز رشتہ مناکحت پر ہو، اس میں مرد کی قوامیت کے ساتھ میاں اور بیوی دونوں کے حقوق اور دونوں پر ذمہ داریاں ہوں۔ اولاد کی پرورش اور تربیت دونوں کی مشترک ذمہ داری ہو۔ اگر اس رشتہ کو توڑنے کی نوبت آجائے تو وہ یونہی ٹوٹ نہ جائے بلکہ طلاق، عدت، مہر اور رضاعت کے چند متعین ضوابط کے تحت ٹوٹے۔ عورتوں اور مردوں کو، جو ایک دوسرے کے لیے غیر محرم ہوں، آزادانہ میل جول کی اجازت نہ ہو بلکہ گھروں کے باہر اور گھروں کے اندر بھی چند معلوم حدود کی پابندی کی جائے۔ ان چند اصولی ہدایات کے تحت ازدواجی زندگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ گذارنا اور اس اجمال میں تفصیل کا رنگ بھرنا میاں اور بیوی کا اپنا کام ہے۔ اسلام اندرون خانہ کی روزمرہ کی زندگی میں کوئی مداخلت پسند نہیں کرتا۔

اسی سے ملتا جلتا ہماری سیاسی زندگی کا معاملہ ہے۔ اس کے متعلق بھی اسلام نے چند بنیادی باتیں طے کر دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ نظام حکومت خدا کی حاکمیت کے نظریہ پر مبنی ہو۔ قانون کا ماخذ خدا کی شریعت ہو۔ اس کے چلانے والے تقویٰ اور دیانت کے اوصاف سے متصف ہوں۔ جہاں شریعت الٰہی کی کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو وہاں سارے معاملات شوریٰ کے ذریعہ سے طے کیے جائیں۔ یہ اور اسی طرح کے چند بنیادی اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک سیاسی نظام کو بنانا اور چلانا اور زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق اس کو

ڈھالنا اور ترقی دینا ہمارا اپنا کام ہے۔ اسلام ان تفصیلات میں نہیں پڑتا جو بالکل انتظامی نوعیت کی ہیں اور جن کا شعور ہر معاشرے کی فطرت کے اندر ودیعت ہے۔

یہ چند چیزیں بطور مثال ذکر کی گئی ہیں، میرا مقصود یہاں نہ تو تمام شعبہ ہائے زندگی کو بیان کرنا ہے اور نہ ان اصولوں کی تفصیل پیش کرنا ہے جو ان شعبہ ہائے زندگی سے متعلق اسلام نے دیئے ہیں۔ میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون اگرچہ ہماری زندگی کے معاملات میں اثباتی حیثیت سے دخیل ہونے کی وجہ سے ہمارے ہر شعبہ زندگی کی حد بندی کرتا ہے لیکن اس حد بندی کے ساتھ ساتھ ہر شعبہ میں وہ ایک نہایت وسیع دائرہ ایسا بھی چھوڑتا ہے جس میں ہمیں وہ متعین آسمانی قوانین کا پابند بنانے کے بجائے آزادی دیتا ہے کہ ہم شریعت کے اصولوں کی روشنی میں اپنی راہ خود معین کریں اور زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے لیے خود قواعد و ضوابط بنائیں۔

ایک طرف وہ پابندی اور دوسری طرف یہ آزادی، ان دونوں چیزوں نے مل کر اسلامی قانون میں ایک طرف تو استحکام اور پائداری کی صفات پیدا کر دی ہے اور دوسری طرف اس میں حرکت، ترقی اور حالات کے ساتھ سازگاری کی خوبیاں بھی نہایت اعتدال کے ساتھ نمو دی ہیں۔

اسلامی قانون کی اس حرکت اور ترقی کو آگے بڑھانے میں جن عوامل نے کام کیا ہے مختصراً ان کا تعارف بھی یہاں ضروری ہے۔

اجتہاد ان میں سب سے پہلا درجہ اجتہاد کا ہے۔ اجتہاد اسلامی قانون کی توسیع و ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اجتہاد کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جو حالات و معاملات ایسے پیش آئیں جن کے بارہ میں قرآن یا سنت میں کوئی واضح قانون نہیں بیان ہوا ہے ان حالات و معاملات کو نظر انداز نہ کر دیا جائے بلکہ ان کو بھی اسلامی شریعت کے تحت لانے کی کوشش کی جائے اور اگر ان کے بارے میں واضح احکام نہیں ملتے تو شریعت کے عام احکام کے اشارات و کنایات سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس رہنمائی کے حاصل کرنے کا ایک مخصوص ضابطہ ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اشارات و کنایات کے انطباق میں آدمی غلطی بھی کر سکتا ہے اور صحیح نتیجہ تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس وجہ سے کسی اجتہاد کو کتاب و سنت کے نصوص کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اجتہاد کی تمام قدر و قیمت درحقیقت اس چیز میں ہے کہ کتاب و سنت سے اس کا لگاؤ کس درجہ کا ہے۔ اگر قوی ہے تو اجتہاد قوی ہے اور اگر ضعیف ہے تو اجتہاد ضعیف ہے۔ اسی وجہ سے اہل علم کے لیے کسی اجتہاد کو

بے چون وچرا مان لینا صحیح نہیں ہے بلکہ ہر صاحب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتاب وسنت کے ساتھ اس کے تعلق کی جانچ کرے اور اسی تعلق ہی کو کسی چیز کے رد یا قبول کی کسوٹی بنائے۔

اس اجتہاد نے اسلامی قانون کی توسیع وترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کی سب سے بڑی شہادت فقہ اسلامی کے اس وسیع ذخیرہ سے ملتی ہے جو آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ زمانہ کے تغیر کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومتوں کو جن نئے نئے معاملات ومسائل سے سابقہ پڑا ہمارے فقہا اور مجتہدین نے اسلامی شریعت کی روشنی میں ان کے حل معلوم کرنے کی کوشش کی اور ان کی اسی کوشش کے نتیجہ میں اسلامی قانون نے یہ وسعت حاصل کی۔ اگر اسلامی قانون میں حرکت اور ترقی کی صلاحیت نہ ہوتی تو یہ عہد نبوت کے بعد جب کہ وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا، بالکل ٹھٹھر کے رہ جاتا لیکن ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ عہد نبوت میں اس کی صرف بنیادیں استوار ہوئی تھیں، ان بنیادوں پر ایک شاندار قصر کی تعمیر صحابہؓ اور فقہائے مجتہدین کے دور میں ہوئی ہے۔

مباحات کا دائرہ

دوسری چیز جو اسلامی قانون کے اندر حرکت وترقی کی صلاحیتوں کی شہادت دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی قانون نے ہماری زندگی کا ایک وسیع دائرہ یہ کہہ کر کہ انتم اعلم بامور دنیاکم بالکل ہماری صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ وہ دائرہ ہے جس دائرہ میں اس نے شروع ہی سے کسی قسم کی مداخلت کو پسند نہیں کیا ہے۔ اس دائرہ میں جو کچھ ہماری مصلحت ہو وہی اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہے اور اسی دائرہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کو سامنے رکھ کر ہم جو قانون بنائیں گے وہ اسلامی قانون ہی کا ایک حصہ ہوگا بشرطیکہ اس میں کوئی چیز شریعت کے کسی امر یا نہی کے خلاف نہ ہو۔

اسلامی قانون اور وضعی قوانین کی حرکت میں فرق

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جہاں تک اسلامی قانون کے متحرک ہونے کا تعلق ہے وہ پورے معنوں میں متحرک ہے۔ صرف وہی شخص اس امر واقعی کا انکار کر سکتا ہے جو اسلامی قانون کے خلاف کسی تعصب میں مبتلا ہو۔ البتہ یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ اسلامی قانون کی حرکت اور وضعی قوانین کی حرکت میں فرق ہے۔ وضعی قوانین کی حرکت کسی ضابطہ اور اصول کی پابند نہیں ہے۔ ان کی حرکت کسی متعین شاہراہ پر نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت کچھ آوارہ گردی کی سی ہے۔ وہ سوسائٹی کے اقدار کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ برابر اپنا چولا بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے سبب سے بسا اوقات وہ اس قدر تبدیل ہو جاتے ہیں کہ ان کے ماضی اور حاضر میں سرے سے کوئی رابطہ باقی رہ ہی نہیں جاتا۔ کل تک جو باتیں ان کے اندر نہایت مکروہ اور گھنونے جرائم میں شمار ہوتی تھیں اور انہی قوانین کے بموجب ان جرائم کے مرتکبین کو سزائیں دی جاتی تھیں آج وہ جرائم انہی قوانین کی رو سے بالکل جائز

اور مباح بن گئے ہیں۔ چنانچہ یورپ، امریکہ اور روس میں زنا، لواطت، اسقاط حمل اور حرامی اولاد سے متعلق سوسائٹی کے نظریات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ قانون بھی تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہا ہے۔ قانون کے متعلق نظریہ تو یہ ہے کہ وہ سوسائٹی اور اس کے اقدار کا محافظ ہوتا ہے لیکن جہاں تک وضعی قوانین کا تعلق ہے ان کی نسبت بے تکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی اس مادر پدر آزاد حرکت کی وجہ سے سوسائٹی کی باندی بن کر رہ گئے ہیں۔

اس کے برعکس اسلامی قانون کی حرکت ایک خاص نظام اور ایک خاص اصول کی پابند ہے۔ یہ حرکت تو کرتا ہے لیکن اپنے بنیادی اصولوں اور بنیادی اقدار کے ساتھ بندھا ہوا حرکت کرتا ہے۔ اس کی حرکت کی شاہراہ متعین اور اس کے چاروں گوشے معلوم ہیں۔ اس کے لیے سرزہ گردی اور اپنے ماضی سے بالکل کٹ جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ زندگی کے تغیرات اور اس کی حرکت کے تقاضے اگر اس کو آگے بڑھنے کے لیے اکساتے اور ابھارتے ہیں اور وہ ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے آگے بڑھتا ہے تو ساتھ ہی اس قانون کے اندر ثبات واستحکام کے بھی کچھ تقاضے موجود ہیں جو اس کو ایک خاص حد سے آگے نکل جانے سے روکے رکھتے ہیں۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے وہ ایک ہی وقت میں جامد بھی ہے اور متحرک بھی یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ وہ ثابت اور سیارہ دونوں ہے۔ وہ سوسائٹی کو آگے بھی بڑھنے کا موقع دیتا ہے اور اس کی حفاظت بھی کرتا رہتا ہے کہ کہیں وہ اپنے فطری اور جائز حدود سے آگے نہ نکل جائے۔

انسانی قانون چونکہ سوسائٹی کے تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اس وجہ سے وہ بگڑتے بگڑتے ایک وقت آتا ہے کہ اتنا بگڑ جاتا ہے کہ اس کے اندر شر غالب اور خیر بالکل ہی مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہ کسی سوسائٹی کے فساد اور بگاڑ کی آخری حد ہوتی ہے کیونکہ اس صورت میں صرف سوسائٹی کے رگ وپے ہی میں فساد کا زہر نہیں سرایت کر جاتا ہے بلکہ قانون جو اس کو اس بگاڑ سے روکنے میں مددگار ہو سکتا تھا خود بھی بالکل زہریلا ہو جاتا ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جب کسی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون عذاب حرکت میں آتا ہے۔ کیونکہ جو قوم خود بھی بگڑ چکی ہو اور اپنے بگاڑ کے ساتھ ساتھ وہ اس سانچہ کو بھی بگاڑ چکی ہو جو اس کی کجیوں کو درست کر سکتا تھا، اس کو قدرت جینے کی مزید مہلت نہیں دیتی۔ ایسی قوم کے اصلاح پذیر ہونے کی کوئی توقع باقی نہیں رہ جاتی۔ اگر دنیا کی تباہ شدہ قوموں کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آئے گی کہ جس وقت وہ تباہ ہوئی ہیں اس وقت ان کے اخلاق وعادات بھی بالکل تباہ ہو چکے تھے اور ان کے اخلاق وعادات ہی کی طرح ان کے زمانہ کا قانون اور نظام عدل بھی بالکل مسخ ہو چکا تھا۔

سفرِ حج

امین احسن اصلاحی

دس دن مدینہ منورہ میں

مدینہ منورہ میں حجاج کے قیام سے متعلق سعودی حکومت کی عام پالیسی یہ ہے کہ وہ دس دن سے زیادہ وہاں کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ بیک وقت اتنی تعداد میں وہاں حجاج کو جمع نہیں ہونے دینا چاہتی جس سے شہری زندگی کا سارا نظم و نسق متاثر ہو جائے۔ انتظامی نقطۂ نظر سے تو اس چیز پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس انتظام سے جذبات کی حق تلفی تھوڑی سی ضرور ہوتی ہے۔ جو لوگ دس دن سے زیادہ مدت کے لیے جوارِ نبویؐ میں ٹھہرنا چاہتے ہیں وہ اپنی یہ تمنا پوری نہیں کر پاتے اور اگر وہ پوری کرنے پر مصر ہی ہوتے ہیں تو انھیں اس کے لیے معلمین سے سودا کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے اس معاملہ میں فیصلہ کیا کہ ہم حکومت کے ایک صحیح انتظام میں غلط طریقہ سے مداخلت نہیں کریں گے اور قانون کو اپنے شخصی جذبات پر ترجیح دیں گے۔

مسجد نبویؐ میں حاضری | دس دن قیام کا فیصلہ کر لینے کے بعد میں نے مسجد نبویؐ میں حاضری کا اسی طرح کا پروگرام بنایا جس طرح کا پروگرام مکہ معظمہ میں حرم کی حاضری کے لیے بنایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسجد نبویؐ میں صبح ۸ – ۹ کے درمیان اور پھر عصر و مغرب کے درمیان اژدحام کسی قدر کم ہوتا ہے۔ چنانچہ معروف اوقات کے علاوہ یہ دونوں وقت بھی میں نے مسجد نبوی کے لیے خاص کر لیے۔ عشا اور مغرب کے درمیان کا وقت بھی میں عموماً وہیں گذارتا۔ کنکریوں والے پلاٹوں میں سے کسی پلاٹ میں جا بیٹھتا اور عشا کی نماز تک وہیں بیٹھا رہتا۔ اس کے ہر پلاٹ میں عموماً اس وقت کوئی نہ کوئی صاحب وعظ فرماتے ہوتے، اس وجہ سے دل جمعی اور یکسوئی تو مشکل سے حاصل ہو پاتی لیکن میں اسی کو غنیمت سمجھتا کہ یہ لمحات مسجد نبویؐ میں گذر جاتے ہیں۔ یہ وعظ کرنے والے حضرات مصر، شام، پاکستان، بھارت غرض مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے ہوتے۔ مگر میں ان

وعظوں سے بہت کم مستفید ہو سکا۔ صرف ایک روز ایک عالم کا وعظ تھوڑی دیر سننے کی کوشش کی۔ یہ غالباً تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے تھے۔ ان کے وعظ میں سنجیدگی اور تاثیر تھی۔ میں اپنا یہ وقت زیادہ تر نوافل یا درود پڑھنے میں گذارتا۔

اللہ تعالیٰ سلطان ابن سعود مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جن کے ذوق و شوق اور جن کی زرپاشیوں سے مسجد نبویؐ شان، عظمت اور حسن کا ایک مرقع بن گئی ہے۔ ماہر انجینیروں نے اس کی تعمیر میں جدید و قدیم دونوں طرزِ تعمیر کی ساری خوبیاں جمع کر دی ہیں اور اس کی ہر چیز شہادت دیتی ہے کہ اس کے ہر کام پر دل کھول کر روپیہ بہایا گیا ہے۔ اس کے چاروں طرف نہایت کشادہ سڑک بنا دی گئی ہے۔ سامنے نہایت وسیع میدان نکال دیا گیا ہے اور سڑک کے کناروں پر نئے طرز پر بنی ہوئی اور سروسامان سے سجی ہوئی دکانیں ہیں۔ دروازے متعدد ہیں اور ہر دروازہ نہایت شاندار اور کشادہ ہے۔ سامنے کے دروازوں میں سے ایک دروازے کا نام حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نام پر ہے۔ یہ نام تو بہرحال محض تیمناً حضرت عمرؓ کے نام پر رکھا گیا ہوگا، لیکن مجھے پہلے ہی دن سے اس دروازے سے کچھ انس سا ہو گیا۔ میں بیشتر اسی دروازے سے داخل ہوتا اور اسی سے نکلتا۔ مسجد میں بیٹھے ہوئے کبھی کبھی میں اس مسجد نبوی کے تصور میں غائب ہو جاتا جو کھجور کے تنوں اور کھجور کے تنوں سے بنائی گئی تھی۔ میرا دل چاہتا کہ کاش اس کے کسی گوشے میں وہ بھی چھپا کر محفوظ کر دی گئی ہوتی تاکہ ہم اپنے ماضی اور حاضر دونوں کا موازنہ کر سکتے۔

روضۂ اقدسؐ پر | روضۂ اقدس پر صبح و شام مناسب اوقات میں سلام کے لیے حاضر ہوتا اور وہی سلام پڑھتا جو عام طور پر ثقہ لوگوں سے منقول ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ مجھے کچھ انشراح حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ دل کے اس انقباض کو میں نے اپنی طبیعت کی کثافت اور اپنی نااہلیت پر محمول کیا۔ بالآخر ایک روز ادب کے ساتھ سلام کرتا ہوا مواجہہ شریف کے بجائے حضورؐ کے پائینتی کی طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے رب تو میرے دل کو نفاق کی سب آلائش سے پاک کر، اگر یہاں سے میں محروم لوٹا تو پھر کس سے پانے کی اُمید کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد عادت کے غلبہ کی وجہ سے میری زبان پر درود شریف جاری ہو گیا۔ میں بڑی دیر تک درود شریف پڑھتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس چیز سے میرا دل کچھ کھل سا گیا۔ اس کے بعد میں نے معمول بنا لیا کہ جالیوں کے سامنے حاضر ہو کر مختصر سلام عرض کرتا اور پھر پائینتی کی طرف جا کر کھڑا ہو جاتا اور درود شریف پڑھتا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید میری طبیعت کو اسی چیز سے زیادہ مناسبت ہے۔ اور اس دربار میں اس گنہگار امتی کی جگہ یہی ہے

جنت البقیع میں اس دوران میں جنت البقیع میں بھی حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جنت البقیع میں عورتوں کو جانے کی سعودی حکومت نے ممانعت کر رکھی ہے اس وجہ سے میری اہلیہ اس میں نہ جا سکیں۔ اپنی اس محرومی کا ان کو بڑا صدمہ ہوا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا عورتوں کا قبروں پر جانا شریعت میں ممنوع ہے؟ میں نے کہا، ممنوع تو نہیں ہے لیکن یہ نجدی حضرات اس معاملہ میں بڑے متشدد واقع ہوئے ہیں، اس وجہ سے صبر کرو اور باہر ہی سے فاتحہ پڑھ لو۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ سارے دوران قیام مدینہ میں اپنی اس محرومی پر بہت دل گرفتہ رہیں۔ ان کو ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور صحابہ وصحابیات کی قبروں پر حاضر ہونے کا بے انتہا شوق تھا، اس شوق کو پورا نہ کر پانا ان پر بڑا شاق گذرا۔ آخر ان بزرگوں کی برکات میں ان خواتین کا بھی تو برابر کا حصہ ہے، پھر ان کو ان کے حصہ سے محروم کرنے کی کوشش کیوں کی جائے؟

جنت البقیع کی حالت دیکھ کر میرے دل پر بڑا صدمہ گذرا۔ مجھے یہ علم تو پہلے سے تھا کہ نجدی فوجوں نے اپنے غلبہ کے ابتدائی دور میں تمام قبریں زمین کے برابر کر دی تھیں لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ سرے سے قبروں کے نشانات ہی مٹا ڈالے گئے ہیں۔ سارا قبرستان بس ایک تودہ خاک کی شکل میں نظر آتا ہے۔ بہت کم قبریں ایسی ہیں جن کے کچھ نشانات موجود ہیں۔ ان پر بھی چونکہ کتبے اور تختیاں وغیرہ لگانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا ہے اس وجہ سے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ فلاں نشان کس کی قبر کا ہے بے خبر معلموں کے بیان ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ اس قبرستان میں امت کے گنجہائے گرانمایہ دفن ہیں۔ اس کی خاک کے نیچے وہ لوگ محو خواب ہیں جن سے زیادہ پاک اور پاکیزہ لوگ ان کے بعد اس زمین کی پشت پر نہ کبھی چلے ہیں اور نہ کبھی چلیں گے، اس کے پردوں میں وہ لوگ چھپے ہوئے ہیں جن کے چہروں سے زیادہ نورانی چہرے چشم فلک نے نہ دیکھے نہ کبھی دیکھے گی۔ ایسے لوگوں کی قبروں کا اس طرح بے نشان ہو جانا طبیعت پر بڑا شاق گذرتا ہے۔

جو مسلمان صحابہ اور صحابیات رضی اللہ عنہم کے حالات اور ان کی سیرتوں کو کتابوں میں پڑھے ہوئے ہے اور اسلام کے لیے ان کی بے مثال جان بازیوں اور قربانیوں سے واقف ہے اس کو ان میں سے ہر صحابیؓ یا صحابیہؓ کی قبر ان کے اس خاص کردار کو یاد دلاتی ہے جو ان کی زندگی میں نمایاں رہا ہے۔ اس نشان کو مٹا دینے کے معنی درحقیقت ایک عظیم کردار کی آخری محسوس نشانی کے مٹا دینے کے ہیں۔ میں قبروں کے معاملہ میں ہرگز کوئی بدعت پرستانہ رجحان نہیں رکھتا۔ میں ان لوگوں کو بالکل فضول قسم کے آدمی سمجھتا ہوں جو کسی قبر پر کسی غیر شرعی مقصد کے لیے جاتے ہیں۔ میرے دوست حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب جانتے ہیں کہ ان معاملات میں میں ان سے کم "وہابی" نہیں ہوں۔ میں خود اور اہل قبور سے

کسی استمداد کو صرف اسلام ہی کے خلاف نہیں بلکہ عقل انسانی کے بھی خلاف سمجھتا ہوں۔ اسی طرح کسی قبر پر سجدہ کرنا یا سر جھکانا یا اس کو بوسہ دینا صرف اپنے رب ہی کی نہیں بلکہ اس شرف انسانی کی بھی توہین سمجھتا ہوں جس کا شعور میرے رب نے خود میرے اندر ودیعت فرمایا ہے لیکن اس سب کے باوجود میں قبروں کی افادیت بالخصوص اسلام کے اعاظم رجال کی قبروں کی افادیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ میں اپنا ذاتی تجربہ عرض کرتا ہوں کہ جس وقت میں سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی قبر پر حاضر ہوا ہوں اور مجھے یہ خیال آیا کہ یہ اس عظیم انسان کی قبر ہے جس نے طاقت اور اقتدار رکھتے ہوئے بھی مظلومانہ شہادت کو ترجیح دی لیکن یہ پسند نہ فرمایا کہ اس کی ذات امت محمد (صلعم) میں کسی خونریزی کا سبب بنے، تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس امت کی محبت اور خیر خواہی کا حقیقی مفہوم آج زندگی میں پہلی بار میرے سامنے آیا ہے۔ میرے نزدیک ان کی قبر اس دنیا میں ان کے اس کردار کا واحد محسوس نشان ہے اور ایک جاننے والے شخص کے لیے اس نشان کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی حال ان تمام صحابہؓ اور صحابیاتؓ کی قبروں کا ہے جن کے کردار سے ہمارے کردار بنتے اور سنورتے ہیں۔ ہمیں ان چیزوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے نہ کہ ان کو بے نشان کرنا چاہیے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اسلام قبروں پر قبے وغیرہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دیتا لیکن اسلام کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ قبریں بے نشان کر دی جائیں۔ بالخصوص ان لوگوں کی قبریں جن کے علم اور عمل سے دنیا نے ہدایت کے نشانات راہ پائے ہیں اور جن کی قبریں فی الواقع دوسروں کے زندہ وجودوں سے زیادہ زندگی بخش ہیں۔

جنت البقیع کے ساتھ یہ سلوک تو حکومت کا ہے۔ رہے عام حجاج اور زائرین تو ان کا سلوک بھی اس کے ساتھ میں نے کچھ اچھا نہیں پایا۔ میں نے اس میں جگہ جگہ انسانی بالوں کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے ہوئے دیکھے۔ اوہام کے مریض زائرین ان بالوں کے تھیلے بھر بھر کے لاتے ہیں اور نگرانوں کی آنکھیں بچا کے اس میں پھینک جاتے ہیں۔ میں یہ تحقیق نہیں کر سکا کہ اس ٹوٹکے کے پیچھے کیا وہم چھپا ہوا ہے لیکن بظاہر یہ عورتوں کا کوئی ٹوٹکا معلوم ہوتا ہے۔ اب عورتوں کی آمد و رفت تو جنت البقیع کے اندر بند ہے اس وجہ سے بالوں کے اس قبرستان میں اس گندگی کے پھیلانے میں ان کی نمائندگی کا فرض ان کے مرد انجام دیتے ہوں گے۔ میں یہ اندازہ صحیح طور پر نہیں کر سکا کہ اس ٹوٹکے میں اہل پاکستان کا کتنا حصہ ہے۔ خدا کرے اس میں ان کا کوئی حصہ بھی نہ ہو۔

میں نے دیکھا کہ بدعات اور اوہام کے مریض اس قبرستان میں نگرانوں کی آنکھیں بچا کے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ مثلاً بہت سے حضرات کو میں نے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی زمین پر قبروں کی سی کچھ لکیریں کھینچ رہے ہیں۔ میں نے ان کی اس حرکت کا سبب فلسفہ معلوم کرنا چاہا تو مجھے بعض دوستوں نے بتایا کہ یہ لوگ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی

قبروں کے نشانات بنا رہے ہیں۔ ان کا تصور یہ ہے کہ جن جن کی قبروں کے نشانات اس مقدس قبرستان میں وہ بنا جائیں گے، قیامت کے دن وہ سارے لوگ اسی قبرستان سے اٹھیں گے۔ ایک یمنی بزرگ نے لوگوں کو یہ حرکت کرتے دیکھا تو ایک طنز آمیز ہنسی کے ساتھ انھوں نے فرمایا کہ لن یُصیبنا الا ما کتب اللّٰہ لنا۔ اگر وہ اردو میں اپنا مدعا کہتے تو غالباً یہ شعر پڑھتے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اطرافِ شہر کی زیارت یہاں مجھے اس بات کی آرزو نہایت شدید رہی کہ اس مبارک شہر کے ان حصّوں کو دیکھوں جو اپنی صورت و ہیئت کے اعتبار سے عہدِ نبوت سے قریب تر ہو سکتے ہیں۔ مسجد نبویؐ کی زیارت سے تو یہ شوق پورا ہو نہیں سکتا تھا۔ مسجد نبویؐ تو، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، بالکل ایک نیا قالب اختیار کر چکی ہے، اس کا پرانا حصہ جو اس نئی تعمیر میں باقی رہنے دیا گیا ہے وہ بھی ترکوں کے زمانہ کا تعمیر کردہ ہے اور شاید اسی وجہ سے باقی رہنے دیا گیا ہے کہ اپنے حسن اور استحکام کے لحاظ سے وہ جدید تعمیر کے ساتھ پوری طرح میچ کرتا ہے۔ اس وجہ سے میں نے یہ اسکیم بنائی کہ روزانہ شام کو روضہ اقدسؐ پر حاضری کے بعد کسی نہ کسی طرف نکل جایا کرتا۔ میں نے خیال کیا کہ اور کہیں نہیں تو اس شہر کے اطراف کے باغوں، اس کے جنگلوں اور کھیتوں، اس کے میدانوں اور اس کی جھاڑیوں میں تو اس عہد مبارک کی کچھ خوبو ہوگی ہی۔ چنانچہ اسی شوق میں میں نے مدینہ منورہ کا پرانا بازار بھی دیکھا۔ اور اسی شوق میں شہر کے قرب و جوار کی جھاڑیوں اور اس کے کھیتوں اور باغوں میں بھی پھرا حالانکہ اس گرم ملک میں تھوڑی دور چلنے سے بھی آدمی تکان اور پیاس محسوس کرنے لگتا ہے۔ سواری اس ملک کے شہروں میں اب اگر کوئی ہے تو موٹروں کی ہے۔ اس سے نیچے درجے کی ساری سواریاں یہاں اب منسوخ ہو چکی ہیں اس وجہ سے کہیں جانا ہو تو یا تو ٹیکسی لیجیے ورنہ پیدل قسمت آزمائی کیجیے۔ عربی گھوڑے جن کی عربی لٹریچر میں ہم نے بڑی تعریفیں پڑھی تھیں یہاں کے شہروں سے تو کم از کم اس طرح غائب ہیں کہ گویا سرے سے ان کا کوئی وجود ہی باقی نہیں رہا ہے۔ گھوڑے تو گھوڑے اونٹ بھی اب کم ہی دکھائی پڑتے ہیں۔ البتہ بعض لوگوں کو گدھے پر بڑے مزے سے سواری کرتے دیکھا اور اس میں شبہ نہیں کہ یہاں کے گدھے بڑے چنچل اور بڑے صبا رفتار ہوتے ہیں لیکن یہ بھی غالباً اب کرایہ پر نہیں ملتے بلکہ بعض باہر سے آنے والے لوگ اپنی سواری کے لیے لاتے ہیں۔

یہاں ایک آسانی یہ ہے کہ آپ مسجد نبویؐ سے نکل کر جنت البقیع کی طرف چلے جائیے تو گویا آپ شہر سے باہر آ گئے۔ یہاں سے کھجور کے باغوں، کھیتوں اور جھاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ایک روز ہم ایک بٹیا سے گذر رہے تھے کہ بچوں اور بچیوں نے مل کر خیر مقدم کے گیت گانے شروع کر دیے۔ اگرچہ اس طرح

کے خیر مقدم کے گیت ساحل جدہ پر اترنے کے بعد سے میں نے بارہا سنے تھے لیکن مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی تھی۔ یہ چیز مجھے عرب قوم کی خودداری کے خلاف معلوم ہوئی کہ اس کے بچے اور بچیاں محض چند ٹکوں کے لیے یہ سائلانہ انداز اختیار کریں۔ لیکن مدینہ منورہ کے بچوں اور بچیوں کی زبان سے جب میں نے یہ نغمہ سنا تو فوراً میرے حافظے میں اس نغمۂ خیر مقدم کی یاد تازہ ہو گئی جو حضورؐ کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے موقع پر اس شہر کی بچیوں نے گایا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ان معصوموں کی لے میں کچھ نہ کچھ مشابہت تو ان معصوموں کی لے کی ضرور ہی ہوگی۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے پہلی بار ان کے اس گیت کو بہت توجہ سے سنا اور میرے کان اب تک اس کی حلاوت محسوس کر رہے ہیں۔

ایک دن اپنی اسی سیر کے سلسلے میں ایک باغ میں چلا گیا۔ باغ کسی اچھے زمیندار کا معلوم ہوتا تھا۔ ٹیوب ویل سے پانی نکالا جا رہا تھا۔ کھجوروں کے درخت نہایت شاداب تھے۔ باغ گھنا تھا اور شادابی حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی اس وجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ باغ پر کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ درختوں پر کھجوروں کے بڑے بڑے خوشے دیکھ کر زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ کھجور کا پھل کس چیز کو کہتے ہیں۔

نالیوں میں شفاف پانی بہتا ہوا دیکھ کر میں اس کو پینے کے لیے بیتاب ہو گیا۔ پاس ہی ایک مزدور کھڑا تھا، جس کی ہر چیز سے غربت اور فلاکت برس رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا بھئی یہ پانی پیا بھی جاتا ہے۔ اس نے کہا ہاں پیا تو جاتا ہے لیکن آپ میرے ساتھ چلیے میں آپ کو ٹھنڈا پانی پلاؤں گا۔ ہم اس کے ساتھ اس کی کوٹھری میں چلے گئے۔ کوٹھری کے سامنے خوب دبل کا حوض تھا۔ اندر ایک جا جم بچھی ہوئی تھی۔ ایک آدھ تکیے بھی پڑے ہوئے تھے۔ عربی طرز کی ایک پیچوان بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی صراحی سے پانی انڈیل کر ہمیں دیا۔ پانی نہایت ٹھنڈا اور نہایت شیریں۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کو کچھ نذر کرنا چاہا۔ اس نے کہا اگر یہ پانی کا معاوضہ ہے تو نہیں۔ میں نے کہا یہ معاوضہ نہیں بلکہ ہماری طرف سے ہدیہ ہے۔ ہدیہ کہنے کے بعد اس نے قبول کر لیا۔ انتہائی غربت کے باوجود اس کی یہ خوش سلیقگی اور خودداری ہمیں بہت پسند آئی۔ ہم اس کے حسن سلوک اور حسن اخلاق سے نہایت متاثر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں دو عورتیں پیچھے پڑ گئیں اور انھوں نے بخشیش کے لیے اس بری طرح ہمارا تعاقب کیا کہ ان سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔

اس طرح ایک دن میں ایک اور باغ میں جا گھسا۔ وہاں ایک کسان کھیت کی مینڈ پر کھڑا تھا اور دو عورتیں کھیت سے سبزیاں بازار بھیجنے کے لیے نکال رہی تھیں۔ عورتوں کے چہروں پر برقعے تھے۔ کسان ہم سے

خوش اخلاق سے ملا۔ میں نے کھیت پر نظر دوڑائی تو مجھے دو سبزیاں کچھ غیر معروف سی نظر آئیں۔ ایک کے پتے کچھ پودینہ کے پتوں سے ملتے جلتے تھے اور دوسری کچھ سبز لہسن سے مشابہ نظر آئی۔ میں نے اس سے ان دونوں سبزیوں کے نام پوچھے، اس نے مجھے ان دونوں کے نام بتائے جو اب مجھے یاد نہیں رہے۔ بس اس قدر یاد ہے کہ ان میں سے ایک کا نام کچھ بڑا ہی ہولناک قسم کا اس نے بتایا۔ شاید "مخندوش" یا اس سے بھی کچھ زیادہ پرہیبت نام اس نے لیا۔ میں نے پوچھا یہ کچی حالت میں کھائی جاتی ہیں یا پکا کر۔ اس نے کہا کچی حالت میں۔ پھر اس نے کچھ پتے توڑ کر اس نے مجھے دیئے اور کہا چکھ کر دیکھو۔ میں نے ان کو چکھ کر اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک کے پتوں میں لہسن اور پیاز کے پتوں کی طرح کی کچھ تیزی ہے اور دوسرے کے اندر پودینہ سے مشابہ خوشبو اور طراوت۔

اسی طرح ایک روز میں ایک اور باغ کے اندر گھس گیا۔ یہاں ہر باغ کے اردگرد چہار دیواری ضرور ہوتی ہے۔ میں اس باغ کے اندر گھسنے کو تو گھس گیا لیکن باغ بہت بڑا تھا اور بالکل اجاڑ پڑا ہوا تھا۔ اس کا پانی کا جو سسٹم تھا وہ بھی درہم برہم تھا۔ پیاس تو یہاں ہر چند قدم پر لگ جاتی ہے اس وجہ سے مجھے پیاس شدت کی تھی۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن کسی متنفس کی آہٹ میں نے نہیں پائی۔ اس وقت سچی بات یہ ہے کہ مجھے سخت وحشت ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ حضور کے زمانے میں یہود کے اسی طرح کے باغ پر خطر سمجھے جاتے رہے ہوں گے۔ آج بھی یہ شہر میں حدود کے نفاذ کا نتیجہ ہے کہ کوئی خطرہ نہیں ہے ورنہ اس طرح کی جگہیں ہر قسم کے بُرے اقدامات کے لیے نہایت مامون ہیں۔ میں فوراً اس باغ سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور ایک دوسرے باغ میں جا کر پانی پیا تب کہیں جا کر گھر لوٹنے کے قابل بنا۔

آثار متبرکہ کی زیارت ہمیں دس دنوں کے اندر ہی اندر مکہ معظمہ کو واپس ہونا تھا۔ واپسی کی تاریخ قریب آ پہنچی تھی اس وجہ سے ضروری تھا کہ ہم دوسرے آثار متبرکہ ـــــ مسجد قبا، مسجد قبلتین، اُحد، خندق وغیرہ کی زیارت سے بھی فارغ ہو جائیں لیکن حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اس دوران میں بیمار ہو گئے۔ اس وجہ سے یہ کام ٹلتا رہا۔ مدینہ منورہ میں اس زمانے میں انفلوئنزا کا کچھ اثر تھا۔ میں نے بہت سے لوگوں کو اس سے متاثر پایا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے حکیم صاحب اس سے متاثر ہوئے۔ اگرچہ حکیم صاحب یونانی، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی کا ایک پورا دواخانہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ میرے ساتھ بھی حکیم اقبال حسین صاحب، ڈاکٹر سلیم الدین صاحب اور ڈاکٹر قیوم سعادت صاحب کی عنایت کردہ دواؤں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا لیکن وہاں کی آب و ہوا کے تقاضوں کو کچھ وہیں کے طبیب اور ڈاکٹر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک حکیم صاحب نے جو اب مدینہ میں ہی رہتے ہیں، ان کا علاج کیا اور اس سے ان کو فائدہ پہنچا۔ واپسی کی تاریخ سے دو ایک دن پہلے حکیم صاحب اٹھ بیٹھے اور ہم ایک روز تمام آثار متبرکہ دیکھ آئے۔

سیدالشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مزار احد کے دامن میں ہے۔ یوں تو سیدالشہداءؓ کی ہر بات یاد رکھنے کے قابل ہے لیکن ان کی ایک بات مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ وہ یہ کہ جب ان کو خبر دی گئی کہ ابوجہل نے ان کے بھتیجے کی توہین کی ہے تو ان کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ فوراً ابوجہل کے پاس پہنچے اور بولے کہ تو نے جس دین کی بنا پر میرے بھتیجے کی توہین کی ہے اس دین کا اعلان اب میں کرتا ہوں تو تجھے جو کچھ کرنا ہے وہ کر لے۔ حق کی حمیت و حمایت کے لیے یہ کیرکٹر ایک مثالی کیرکٹر ہے۔ سیدالشہداء کی قبر پر آدمی جب پہنچتا ہے تو ان کی سیرت کے اس پہلو کا خیال آتے ہی دل جوش محبت سے اچھلنے لگتا ہے۔ میں نے ان کی قبر پر اپنے لیے یہ دعا کی کہ اے رب تیرے رسولؐ کے لیے حمیت و حمایت کا جو جوش و جذبہ سیدالشہداء کے سینہ میں تھا وہ جوش و جذبہ تو میرے سینے میں بھی پیدا کر دے۔

یہاں پولیس کا جو آدمی نگرانی پر مامور تھا اس سے میری ہلکی سی جھڑپ ہو گئی۔ میری اہلیہ نے فاتحہ اور دعا کے لیے قبر کے قریب جانا چاہا تو پولیس والے نے ان کو روکا۔ اس کے روکنے کا انداز کچھ ناتراشیدہ سا تھا میں نے اس کو سختی سے ڈانٹا۔ میرے غصہ کے جواب میں اس نے کسی غصہ کے اظہار کے بجائے صرف اتنی بات کہی کہ ہم تو چند ہدایات کے ساتھ یہاں مامور ہیں، ہم ان ہدایات کی تعمیل کرتے ہیں۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی چیز آپ کی خواہشوں کے خلاف ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ مجھے اس کی یہ بات بہت معقول معلوم ہوئی اور مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اگرچہ بدعت پسند حاجیوں کی بے قاعدگیوں سے تنگ آ کر کبھی کبھی یہ لوگ اپنا تحمل کھو بھی بیٹھتے ہیں لیکن بالکل ناتراشیدہ نہیں ہیں بلکہ اپنے کام کے لیے تربیت پائے ہوئے ہیں۔

اسی طرح کا تجربہ مجھے ایک دن مسجد نبویؐ میں بھی ہوا۔ میری اہلیہ نے ایک روز مجھ سے کہا کہ میں صُفّہ پر نفل پڑھنا اور اپنے لڑکیوں کے مدرسہ کے لیے دعا کرنی چاہتی ہوں۔ اتفاق کی بات کہ جس وقت انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی صفہ مردوں سے تقریباً خالی تھا۔ میں نے ان سے کہا بسم اللہ، دو رکعت پڑھ کے جو دعا مانگنی ہے مانگ لو۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ صفہ پر عورتوں کو جانے کی ممانعت ہے۔ ایک حبشی خادم مسجد نے جب ایک عورت کو صفہ پر نماز پڑھتے دیکھا تو وہ بھاگا ہوا آیا اور میری اہلیہ کو جب کہ وہ نماز پڑھ رہی تھیں سخت سست کہنے لگا اور اپنے عام طریقہ کے مطابق چاہا کہ ان کو وہاں سے عین حالت نماز میں اٹھا دے۔ مصر، شام، حبشہ اور یمن کی خواتین کے ساتھ میں نے ان کا یہ رویہ بارہا دیکھا تھا اور اس سے مجھے بڑی تکلیف تھی۔ چنانچہ جب وہ قریب آیا تو میں نے اس کو سختی سے روکا اور کہا کہ ان کو نماز ختم کر لینے دو۔ اتنے میں پولیس کا آدمی بھی پہنچ گیا اس نے کہا عورتوں کے لیے یہاں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔

میں نے کہا کس نے منع کیا ہے، کیا خدا اور رسول نے؟ اس پر وہ ٹھنڈا پڑ گیا اور بولا کہ ہم تو حکومت کی طرف سے مامور ہیں۔ میں نے کہا، میں نے آپ لوگوں کا جو رویہ خواتین کے ساتھ دیکھا ہے وہ قابل اعتراض ہے۔ میں اس کو حکومت کے نوٹس میں لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اتنے میں ایک اور بزرگ نے بیچ میں مداخلت کی اور بڑے شائستہ انداز میں ان لوگوں کی مجبوریوں کی طرف توجہ دلائی۔

اس میں شبہ نہیں کہ مکہ معظمہ میں بھی اور مسجد نبوی میں بھی خدام اور عورتوں کے درمیان ہر وقت ایک آنکھ مچولی سی ہوتی رہتی ہے۔ نمازوں کے اوقات میں خدام عورتوں کو مطاف میں یا روضۂ اقدس پر جانے سے روکتے ہیں لیکن میں نے بہت سی مصری اور شامی خواتین کو دیکھا ہے کہ وہ ان کے روکنے کی ذرا بھی پروا نہیں کرتیں۔ اگر کرتی بھی ہیں تو اس سے زیادہ نہیں کہ اگر وہ ایک طرف سے روک دی جاتی ہیں تو دوسری طرف سے نظر بچا کے اسی جگہ پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں جس جگہ سے ان کو روکا جاتا ہے۔ اس طرح معاملہ اکثر اوقات سخت کلامی تک پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات خدام اپنی وہ چھڑیاں بھی استعمال کرتے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔ بلکہ اس سے گذر کر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ شانے پکڑ پکڑ کر ان عورتوں کو دھکے دیتے اور روکتے ہیں۔ میرے لیے اس صورت حال کا مشاہدہ سخت تکلیف دہ رہا۔ کبھی مجھے ان خواتین کی ضد اور ہٹ دھرمی پر غصہ آتا اور کبھی خدام کی زیادتی اور بے اعتدالی پر۔ میرے نزدیک اس صورت حال کی اصلاح ضروری ہے اور میں اس کی اصلاح کے لیے ایک تجویز آگے چل کر پیش کروں گا۔

ایک دلچسپ واقعہ

ایک روز ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہم مسجد نبویؐ میں مغرب کے بعد بیٹھے تھے کہ بجلی دفعتہً گل ہو گئی۔ بجلی کا گل ہونا تھا کہ مسجد نبویؐ کا وہ حصہ جو خواتین کے لیے مخصوص ہے (اور وہ تقریباً آدھا ہے) تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی مقرر کے کسی پرزور فقرے پر حاضرین کی طرف سے داد دی جا رہی ہو۔ مجھے اس واقعہ پر سخت حیرانی ہوئی۔ مسجد نبوی کے اندر یہ تالی پیٹنے کی جسارت کون لوگ کر سکتے ہیں؟ ہمارے زمانہ قیام میں بیشتر زائرین مصر اور شام سے تعلق رکھنے والے تھے۔ قدرتی طور پر خواتین میں بھی اکثریت مصر اور شام ہی کی خواتین کی تھی۔ میں مصر اور شام کی خواتین کی آزادہ روی کا تو قائل ہوں لیکن یہ گمان نہیں رکھتا تھا کہ وہ اپنی اس آزادی کے لیے مسجد نبویؐ کے احترام کو بھی بالائے طاق رکھ دیں گی۔ جب میں مسجد سے باہر نکلا تو میں نے بعض لوگوں سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ مصر و شام کی خواتین جب بجلی کبھی گل ہو جاتی ہے تو اسی طرح تالی بجا کر اس کو بلایا کرتی ہیں۔ یہ بات کچھ میرے دل کو نہیں لگی۔ میں حیران ہوا کہ اس طرح کے کسی واہمہ پر اس درجے کا اذعان لوگوں کو کس طرح ہو سکتا ہے کہ ادب و احترام کی اس سب سے بڑی جگہ میں بھی وہ طبائع پر غالب ہو جائے۔ بالآخر ایک روز میرا یہ شک

دور ہو کے رہا۔ عرفات سے مزدلفہ واپس ہوتے ہوئے ایک مرتبہ ہماری بس کی روشنی گل ہو گئی۔ میرے قریب ایک مصری بچی بیٹھی ہوئی تھی۔ روشنی کا گل ہونا تھا کہ اس نے فوراً تالی پیٹ پیٹ کر روشنی کو بلانا شروع کر دیا۔ روشنی کو بلانے کا انداز اس کا بڑا معصومانہ تھا۔ تین مرتبہ تالی بجاتی اور پھر اپنے داہنے ہاتھ کو اوپر کی طرف لے جا کر اس طرح نیچے کی طرف لاتی گویا روشنی کو رہنمائی دے رہی ہے کہ یوں آجا۔ اس معصوم بچی کی اس معصومانہ ادا نے میری ایک بہت بڑی الجھن دور کر دی اور خدا ڈرائیور کا بھی بھلا کرے کہ اس نے اسی اثنا میں سوئچ آن کر دی اور بچی خوش ہو گئی کہ اس کا جادو کامیاب رہا۔

ملاقاتیں

یہاں میرا ملنا جلنا لوگوں سے بس برائے نام ہی رہا۔ حکیم صاحب بھی بیمار ہو جانے کے سبب سے کچھ زیادہ ہیرا پھیری نہ کر سکے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اب اہل سیاست ہوں یا ارباب علم و مذہب سب یا تو مکہ معظمہ اور جدہ میں قیام کو ترجیح دیتے ہیں یا ریاض میں۔ مدینہ منورہ میں تو وہی شخص اب رہنا پسند کرتا ہے جسے دنیا سے کوئی تعلق نہ رہ گیا ہو۔ دور خلافت راشدہ میں تمام علم اور تمام دین کا مرکز اور منبع یہی شہر تھا۔ اس شہر کی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ عمل اہل مدینہ فقہ مالکی میں ایک حجت شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے امام اہل مدینہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر ان کا یہ اصول یاد آیا اور اس بات سے سخت صدمہ ہوا کہ جس شہر سے ساری دنیا کو ہدایت و رہنمائی ملی اب اگر وہاں کوئی صاحب کمال ہے بھی تو کسی گوشہ گمنامی میں ہے۔

یہاں میرے دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ اگر کسی درویش عالم کا پتہ چلا تو اس کی زیارت کو ضرور جاؤں گا لیکن حکیم صاحب کی علالت نے یہ خواہش پوری ہونے نہ دی۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ دھوپ میں یہاں باہر نکلنے کی ہمت ہوتی نہیں اور سواریوں کا یہاں جو حال ہے اس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ اسی مشکل کی وجہ سے مولانا شاہ بدر عالم صاحب سے بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ حالانکہ مجھے ان سے نہ صرف خود دیرینہ اشتیاق ملاقات تھا بلکہ میرے دوستوں میں سے شیخ سلطان احمد صاحب اور سردار محمد اجمل خان صاحب لغاری نے ان سے ملنے کی مجھے تاکید بھی کی تھی۔ علاوہ ازیں مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ اس عاجز سے خود بھی ملاقات کی خواہش رکھتے ہیں۔ ایک دن خاص طور پر وقت نکال کر ان کے دولت خانہ پر حاضر بھی ہوا تو وہ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔

بھارت اور پاکستان کے کچھ جاننے والے میری قیام گاہ پر کسی کسی وقت آ جاتے، ان سے ملاقات ہو جاتی۔ میرے ایک قدیم ہم وطن حافظ فصیح اللہ صاحب جن کا ذکر اوپر کہیں گذر چکا ہے، بہ اصرار کئی مرتبہ اپنے مکان پر لے گئے اور پھلوں سے تواضع کی۔ ایک شامی عالم، جن کا نام مجھے افسوس ہے کہ یاد نہیں رہا، ہمارے ہاں کئی بار تشریف لائے۔ ان سے مصر و شام کے اتحاد کے مسائل پر گفتگوئیں رہیں۔ نہایت دیندار، متواضع اور بے تکلف آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن

عرب قومیت کے بڑے علم بردار تھے۔

روانگی کے وقت کا ایک خاص تاثر

دس دن کی مدت ہی کیا ہوتی ہے، دل کا کوئی ارمان بھی ابھی پورا نہیں ہو پایا تھا کہ واپسی کی تاریخ آگئی۔ اس دوران میں ایک خلش نے میرے دل کو برابر پریشان رکھا۔ وہ یہ کہ میں نے بہتوں کو دیکھا کہ ان کے دل کی حالت میرے دل کی حالت سے کہیں بہتر ہے۔ وہ روضہ اقدسؐ پر حاضر ہوتے ہیں تو ان کی آنکھیں شہادت دیتی ہیں کہ ان کے سینوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی گرمی موجود ہے۔ میں اپنا حال یہ نہیں پاتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں حضورؐ کی محبت خدانخواستہ اپنے دل کے اندر نہیں محسوس کرتا تھا، محسوس تو بہت کچھ کرتا تھا، کبھی کبھی تو ایسی کیفیت محسوس کرتا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ روضہ اقدس کے سامنے دل کو نچوڑ کے رکھ دوں لیکن آنکھوں کی راہیں کچھ کچھ بند بند سی محسوس کرتا تھا۔ دس دن کی مدت اسی ذہنی اور قلبی الجھن میں گذر گئی۔ مجھے اندر اندر یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ یہ حالت دل کی سختی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ روانگی کے دن میرا یہ احساس بہت شدید ہو گیا۔ میں جب وداعی سلام کے لیے حاضر ہوا ہوں تو اپنے اس احساس کے سبب سے اس قدر دل شکستہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ میری زندگی اب ہر ارمان اور ہر حوصلہ سے بالکل خالی ہو گئی ہے۔ میں جب مسجد نبوی میں حاضر ہوا تو اس وقت اژدہام نہیں تھا۔ میں نے روضۂ جنت میں نفل پڑھی اور سجدے میں میں نے دعا کی کہ اے رب میں تیرا گنہگار بندہ اور تیرے نبی کا گنہگار امتی ہوں، اگر تو نے مجھ پر یہ فضل فرمایا کہ میں تیرے ان مقدس اور پاک گھروں میں حاضری دے سکا تو تو مجھے یہاں سے محروم نہ واپس کر۔ میں اس زندگی میں یہ سعادت پھر حاصل کر سکوں گا یا نہیں اس کو تو ہی جانتا ہے اور یہ چیز تیرے ہی اختیار میں ہے، اپنے غلام پر رحم کر اور میرے دل کی حالت بدل دے۔ اگر میں تیرے اس دروازے سے بھی محروم لوٹا تو وہ کونسا دروازہ ہے جہاں میں کوئی امید لے کر جا سکتا ہوں۔ اللھم انی اعوذ برضاک من سخطک وبمعافاتک من عقوبتک واعوذ بک منک لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔

اس دعا کے بعد آخری سلام کے لیے حاضر ہوا۔ مواجہہ شریف میں پہنچا تو ابھی سلام کا پہلا ہی کلمہ زبان سے ادا ہو پایا تھا کہ دفعتہً محسوس ہوا کہ دل کے اندر ایک بند تھا جو ٹوٹ پڑا ہے اور آنکھوں سے ایک طوفان ہے جو ابل پڑا ہے۔ میں زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ دیوار سے سہارا لے کر دو زانو بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب رخصت ہونا چاہا تو دل کسی سلام کو بھی آخری سلام ماننے کے لیے تیار نہ ہو۔ چند قدم دروازے کی طرف بڑھوں تو دل پھر مجبور کرے کہ ایک مرتبہ حضورؐ کو اور سلام کر آؤں۔ یہ سعادت پھر اس زندگی میں حاصل ہو یا نہ ہو۔ بڑی دیر کے بعد جب

اس کشمکش سے چھوٹا تو اسی طرح کی کشمکش سے مسجد نبویؐ کے دروازے سے نکلتے ہوئے دوچار ہوا۔ جب قدم باہر نکالوں اور یہ خیال آئے کہ معلوم نہیں اب اس گھر میں پھر داخل ہونا نصیب ہو یا نہ ہو تو دل بیٹھنے لگ جائے۔ مگر اس زندگی میں ہمیشہ دل ہی کی نہیں چلتی۔ آخر مجبور ہو کر مسجد نبویؐ سے اور روضہ اقدسؐ سے جدا ہونا ہی پڑا۔

مکہ معظمہ کو واپسی

لاری مسجد نبویؐ کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ روانگی کا معینہ وقت گذر چکا تھا مگر معلم صاحبان کی بے قاعدگی نے ایک ایسا الجھاؤ پیدا کر دیا تھا کہ کوئی شکل اس کے روانہ ہونے کی بنتی ہی نہیں تھی۔ جتنے آدمی اس لاری سے جا سکتے تھے معلم صاحبان نے اس سے زیادہ آدمیوں کو اس سے بھیجنے کے وعدے دے رکھے تھے۔ یہ سارے ہی آدمی آدھمکے۔ ان کا سامان بھی زیادہ اور ان کی تعداد بھی زیادہ۔ حجاج کی لاریوں کے لیے یہ ضابطہ ہے کہ نہ وہ زیادہ سواریاں اٹھا سکتی ہیں، نہ کم۔ معلم صاحبان اگر کسی قافلہ کے دوچار آدمیوں کو کم کرنا چاہیں تو پورا قافلہ صدائے احتجاج بلند کرے۔ بڑی دیر تک ایک نہایت ناگوار بحث چلتی رہی۔ تعداد یا تو حد معتاد سے زیادہ ہو جائے یا کم، میزان برابر کسی طرح سے بھی ہونے ہی میں نہ آئے۔ میرا یہ وقت بڑی ذہنی کوفت میں گذرا، البتہ یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ایک نماز مسجد نبوی میں ادا کرنے کا اور موقع مل گیا۔ بالآخر حکم صاحب بیچ میں پڑے اور اس قضیہ کے طے ہونے کی کوئی شکل نکلی۔ گاڑی روانہ ہوئی اور ہم نے بادل پر غم و بادیدہ پرنم مدینۃ الرسولؐ کو الوداع کہا۔

شہر سے باہر نکلتے ہی ڈرائیور نے بخشش کا مطالبہ کیا، اس کا مطالبہ پورا کر دیا گیا۔ عمرہ کے لیے احرام تو ہم نے گھر سے ہی باندھ لیا تھا لیکن راستہ میں بیر علی کے پاس، جہاں سے حضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر احرام باندھا تھا، تھوڑی دیر کے لیے اترے، دو رکعت نفل پڑھی اور ارادہ کی تجدید کرلی۔

بقیہ انفاق اور آفات انفاق

کچھ اہتمام نہیں رہ گیا ہے۔ حالانکہ تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ خصوصاً جو شخص اپنے انفاق کو ریا کی آلائش سے پاک دیکھنا چاہتا ہے اس کے لیے تو اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے کہ وہ جتنا علانیہ خرچ کرے اس سے زیادہ پوشیدہ طور پر خرچ کرے جس کی اس کے رب اور اس شخص کے سوا کسی کو بھی خبر نہ ہو جس کے لیے اس نے خرچ کیا ہے۔